تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور - پاکستان

اہم اعلان

مولانا **امین احسن اصلاحی** کی درج ذیل معرکۃ الآراء تصانیف کے مکمل نظرثانی شدہ جدید ایڈیشن الحمدللہ شائع ہوگئے ہیں:

- ○ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار ‎ ۳۳/- روپے
- ○ حقیقتِ نماز ‎ ۱۸/- روپے ○ حقیقتِ تقویٰ ‎ ۱۸/- روپے
- ○ حقیقتِ شرک و توحید ‎ ۵۶/- روپے
- ○ مبادیٔ تدبرِ قرآن ‎ ۳۶/- روپے
- ○ قرآن میں پردے کے احکام ‎ ۴/- روپے
- ○ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام ‎ ۳۶/- روپے

علاوہ ازیں ان کی مندرجہ ذیل کتب بھی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں جو ان شاء اللہ جلد دستیاب ہوں گی:

- ○ تزکیۂ نفس ۔ جلد دوم
- ○ مبادیٔ تدبرِ حدیث
- ○ اسلامی قانون کی تدوین
- ○ اسلامی ریاست
- ○ مجموعہ تفاسیرِ فراہی
- ○ مقالاتِ اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن
۱۲۲۔ فیروزپور روڈ لاہور
۵۴۶۰۰
فون: ۲۷۳۴۷۷

سلسلہ نمبر ۲۶ ‎ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ ‎ اکتوبر ۱۹۸۸ء

تدبر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ
عظیم قومی سانحہ ———— امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن
تفسیر سورۃ انعام (۱) ———— خالد مسعود ۹

تدبرِ حدیث
نمازوں کے اوقات (۳) ———— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۴

حکمتِ قرآن
ختمِ نبوت کی فلسفیانہ بنیاد ———— امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۲۷

افاداتِ فراہی
حکمتِ قرآن (۵)
حکیم کا طرزِ فکر و تعلیم ———— خالد مسعود ۳۸

تبصرۂ کتب
اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام ———— سعید احمد ۴۶
ایضاح القرآن ———— سعید احمد ۴۷

مجلسِ ترتیب

- ——— خالد مسعود (مدیر)
- ——— عبداللہ غلام احمد
- ——— ماجد خاور
- ——— محبوب سبحانی

ناشر : ——— ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، رحمن آباد لاہور۔ ۲۵

مطبع : ——— المطبعۃ العربیۃ ۔ لاہور

قیمت : ۵/= روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عظیم قومی سانحہ

صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق شہید رحمۃ اللہ علیہ اور افواجِ پاکستان کے چیدہ جرنیلوں اور افسروں کی بہاولپور کے قریب ہوائی حادثہ میں رحلت ہمارے لیے ایک عظیم قومی سانحہ ہے۔ یہ سب اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے ہوئے ایک اچانک موت سے دوچار ہوئے۔ اس خاص صورتِ حال کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ ان سب کے لیے تو یہ بہت بڑی سرفرازی ہے لیکن ہمارے ملک میں ان کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیسے بھرے گا۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑے شر سے بھی خیر پیدا کر دیتا ہے۔ اگر وہ ہمارے اوپر مہربان ہو جائے تو عجب نہیں کہ اس سانحہ سے بھی ہماری قوم کے لیے بہتری کے کچھ آثار پیدا ہو جائیں۔

یوں تو ان تمام شہدا میں سے ایک ایک فرد ہماری قوم کے لیے نہایت قیمتی تھا لیکن صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کا اس حادثہ میں جاں بحق ہو جانا بوجوہ نہایت صدمہ کی بات ہے۔ وہ گیارہ سال سے اس ملک کے حکمران تھے۔ ملکی معاملات ان کی گرفت میں تھے اور بعض بین الاقوامی معاملات کی وہ بذاتِ خود نگرانی کر رہے تھے۔ منظر سے ان کا یک لخت ہٹ جانا ملک کو کئی پیچیدہ مسائل سے دوچار کر سکتا ہے۔ خدا کرے کہ ان کی رحلت کے باعث جو خلا پیدا ہوا ہے ہماری قوم اس کو پُر کرنے کی توفیق پائے۔

ضیاء صاحب کو قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا بلکہ پہلے کبھی ان سے شناسائی بھی نہیں رہی۔ میں ان کی زندگی کے اسی دور سے واقف ہوں جب وہ اس ملک کے حکمرانِ مطلق تھے اور کوئی ان کے حکم کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ حکمران بھی وہ کسی چھوٹے ملک کے نہیں بلکہ ایک بڑے ملک کے تھے جو دنیا کے جغرافیے میں ایک بڑا مقام رکھتا ہے۔ دورِ حکمرانی بحیثیت انسان کسی آدمی

کے امتحان کے لیے فی الحقیقت موزوں ہوتا ہے۔ ہما شما غریب لوگوں کے اندر انسانیت، خاکساری اور تواضع ہو تو لوگ بجا طور پر اسے عصمت بی بی از بے چادری پر محمول کرتے ہیں۔ معمولی لیڈروں کو میں نے دیکھا ہے کہ کچھ آدمی ان کے پیچھے چلنے والے اور ان کا کلمہ پڑھنے والے مل جائیں تو ان کی بھویں تن جاتی ہیں، پیشانی پر شکن آجاتی ہے۔ چہرے پر عبوست طاری ہو جاتی ہے، چال میں کچھ تبختر آجاتا ہے، گھر سے نکلتے ہیں تو نہ جانے کتنی بار آئینہ دیکھتے ہیں۔ نئے لوگوں سے ملنے کا امکان ہو تو بڑے رکھ رکھاؤ سے کام لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ضیاء صاحب کو میں نے خود بھی دیکھا ہے، اس کے علاوہ لوگوں سے سن کر اور اخباروں میں ان کے واقعات پڑھ کر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ان کے اندر بے مثال انسانیت تھی۔ وہ نہایت بے تکلف انسان تھے جس سے ملتے بڑی تواضع، بڑی ملنساری، بڑی سادگی اور نہایت بے تکلفی سے ملتے۔ کوئی شخص ان سے بات کرتے ہوئے ذرا بھی حجاب محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر بات حتیٰ کہ اعتراض کا جواب بھی مسکراتے اور کھلکھلاتے ہوئے دیتے۔ کسی طرف سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ ملک کے حکمران ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ان کی آئینی مجبوریاں اور پروٹوکول اور سیکورٹی کے تقاضے نہ ہوتے تو وہ قرونِ اولیٰ کے بادشاہوں کی طرح سڑکوں پر بھی پھرتے۔

پچھلے سال جب انہوں نے مجھ سے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ایک جنرل صاحب ان کا پیغام لے کر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ میں کہیں آتا جاتا نہیں اور اگر صدر صاحب سے ملاقات ہو بھی گئی تو مجھ جیسے بہرے آدمی سے وہ بات کیا کریں گے۔ میرے اس کورے جواب کو محسوس کرنے کے بجائے انہوں نے پیغام بھیجا کہ اگر ضرورت ہو تو علاج کے لیے ڈاکٹر اور کان میں لگانے کے لیے آلہ سماعت بھیج دیا جائے۔ نیز ملاقات کے لیے میرے اسلام آباد جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، صدر صاحب جب لاہور آئیں گے تو خود مل لیں گے۔ میں نے سمجھا کہ بات آئی گئی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ نہیں بھولے تھے۔ جب لاہور آئے تو مجھے ملنے کے لیے میرے مکان پر تشریف لائے۔ ان کے آنے میں تو بلاشبہ وہی شان و شکوہ تھا جو موجودہ زمانے کا تقاضا ہے لیکن جب وہ گاڑی سے اترے تو نہایت بے تکلفی سے ملے۔ میں نے صرف مصافحہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے بڑی محبت سے سینے سے لگایا۔ گفتگو کے دوران بار بار اس بات کا اظہار فرماتے رہے کہ ایک عرصہ سے ملاقات کا شوق تھا، میں ہرگز کسی غرض کے لیے یہاں نہیں آیا۔ میں نے کہا یہ غرض بھی تو ہو سکتی ہے کہ آپ ایک طالب علم کی عزت بڑھانا چاہتے ہوں۔ جاتے ہوئے

دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ میں نے کہا آپ جب بھی تشریف لائیں گے میری عزت ہی بڑھے گی، اس میں میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ اس ملاقات کے بعد بالواسطہ خیریت دریافت کرتے رہے لیکن ملنے کا موقع نہیں ملا۔

مجھے حکمرانوں سے کبھی راہ و رسم نہیں رہی۔ البتہ اس ملک کے ایوانِ وزارت اور ایوانِ صدارت میں جو لوگ پہنچے ان میں چودھری محمد علی صاحب سے میرے بھی تعلقات تھے۔ وہ بہت فرشتہ آدمی تھے لیکن ان کے بارے میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو شاہ ولی اللہؒ نے حضرت علیؓ کے بارے میں لکھی ہے کہ جناب امیرؓ خلیفہ راشد ضرور تھے لیکن آنجناب کی خلافت منعقد نہیں ہوئی۔ صدر ایوب خان مرحوم نے ایک مرتبہ گورنر ہاؤس میں بلوایا تو ان کے چہرے بشرے سے بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکمران ہیں۔ ان کی خاکساری اور تواضع میں بھی حکمرانی جھلکتی تھی اور میرے نزدیک یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ بعض لوگوں میں مصنوعی تواضع بھی ہوتی ہے یعنی تواضع کا اظہار کرتے ہیں BUT WITH GREATER PRIDE جس طرح ایک فلسفی کسی بادشاہ کے دربار میں گئے تو نہایت قیمتی قالینوں پر اپنا میلا جوتا رگڑنے لگے۔ بادشاہ نے پوچھا، بزرگوار، یہ کیا حرکت ہے، انہوں نے جواب دیا، اس طرح میں تیرے غرور کو پامال کر رہا ہوں، اس پر بادشاہ نے کہا، پھر تو آپ میرے غرور سے بھی بڑے غرور سے اس کو پامال کر رہے ہیں۔ ضیاء صاحب، واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ بھی تھے اور اس کے ساتھ ان کے اندر کمال درجہ انسانیت بھی تھی۔ غریب اور بیوہ عورتیں ان تک پہنچ جاتیں۔ مظلوم لوگ ان تک رسائی حاصل کر لیتے۔ راستہ چلتے ہوئے کوئی شخص درخواست لے کر کھڑا ہوا نظر آجاتا تو اپنی کار رکوا کر اس سے بات کرتے۔ غریبوں کا درد ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ خود غریب خاندان سے آئے تھے۔ کتنے لوگ ہیں جو غریب ہوتے ہیں لیکن انہیں غریبوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ضیا صاحب بنفسہٖ شریف اور ہمدرد انسان تھے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے غور کیجئے تو وہ جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک سچے اور مخلص مسلمان نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے بھی تھی لیکن وہ دین سے بے پروا نہیں تھے بلکہ جس چیز کو دین کا تقاضا سمجھتے اس کو کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ پختہ نمازی، تہجد گزار، اشراق پڑھنے والے اور اوراد و وظائف کے سختی سے پابند تھے۔ ان کی اکثر خواہش ہوتی کہ ان کی رمضان کی راتیں حرمِ مکہ اور حرمِ مدینہ میں گزریں۔ نہایت اہتمام کے

ساتھ اتفاق کرتے۔ دینی کتابوں کا مطالعہ بار بار کرتے تھے میری کتاب تدبر قرآن کا ذکر آیا تو انہوں نے خود بتایا کہ میں نے یہ کتاب کل پڑھی ہے اور نہ صرف پڑھی ہے بلکہ اس کا مقابلہ دوسری تفاسیر کے ساتھ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایوانہائے صدارت و وزارت میں رند شاہد باز تو بہت آئے لیکن ان کی زمین اگر کسی کے سجدوں سے آشنا ہوئی تو وہ ضیاء مرحوم کے سجدے ہیں۔ اور ان کے در و دیوار کسی کی دعاؤں، مناجاتوں اور خدا کے ساتھ سرگوشیوں سے باخبر ہوتے ہیں تو وہ اسی مرد حق کی مناجاتیں اور سرگوشیاں ہیں۔

اجتماعی طور پر دیکھیے تو قرارداد مقاصد پاس کرنے کرانے والے تو بڑے طمطراق سے اپنی اس خدمت کا چرچا کرتے رہے لیکن دین کی خاطر کسی نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو وہ ضیاء صاحب ہی تھے۔ انہوں نے دفاتر میں نمازوں کا اہتمام کیا۔ زکوٰۃ کے نظام سے غریبوں کی مدد کا ایک موثر ذریعہ پیدا کیا۔ دینی مدارس جن کی گزر اوقات پہلے صدقے اور خیرات کی روٹیوں پر تھی، اس نظام زکوٰۃ کی بدولت ان کی اتنی امداد ہوئی کہ مولوی بھی کاروں میں سفر کرنے کے قابل ہو گئے۔ انہوں نے سودی نظام کے خاتمہ کے لیے اقدامات کیے۔ قانون کے شعبہ میں بعض موثر قدم اٹھائے۔ رہ گئی یہ بات کہ ان کی ان خدمات سے وہ خیر و برکت ظاہر نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی تو میرے نزدیک اس میں قصور ضیاء صاحب کا نہیں بلکہ معاشرہ کا ہے۔ وہ ہر جگہ خود جا کر تو نماز نہیں پڑھا سکتے تھے یا غریبوں میں زکوٰۃ کی رقم تو نہیں بانٹ سکتے تھے۔ حکومت کے افراد اور معاشرہ کے لوگ تو وہی رہے جو پہلے تھے۔ ضیاء صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جب تک معاشرے کو تبدیل نہ کیا جائے اس وقت تک اس میں نیکی کا بیج ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بات ان کو سمجھانا ان سے زیادہ زیرک لوگوں کا کام تھا۔ وہ انہیں سمجھاتے کہ زمین ہموار کرنے کے لیے انہیں کیا کیا کام کرنے ہیں۔ اس طرح کے معاملات کا فہم اور دین کا شعور ہماری بدقسمتی سے ان لوگوں کو بھی نہیں ہے جو اسلام کے لیے اٹھے، اس پر مرنے اور جینے کا دعویٰ کرتے ہیں، اسی کی روٹی کھاتے ہیں اور اسی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ یہ جہاد کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں اور اگر پوچھا جائے کہ یہ جہاد کس طرح کرو گے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ اسلامی نظام کے بارے میں یہ بے شعوری ہر اسلامی ملک میں پائی جاتی ہے۔ اگر ضیاء صاحب اس کو نہیں سمجھے تو یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اب انہیں معاشرے کی اصلاح کا احساس ہونے لگا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نظام تعلیم میں تبدیلی لانے کے لیے کچھ اقدامات کیے تھے لیکن وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

جہاں تک سیاست دانی کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں قائداعظم کا مقام بہت اونچا تھا۔ اس ایک استثنا کے سوا ملک میں وہ واحد شخص تھے جو ایک صحیح قسم کے سیاست دان کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے زمانے میں بڑے معرکے کے امتحان پیش آئے لیکن انہوں نے نہایت ہی مدبرانہ قدم اٹھائے۔ مدبرانہ قدم وہ نہیں ہوتا جس کے اٹھاتے ہی لوگ واہ واہ کرنے لگیں ہو سکتا ہے کہ اس وقت تو لوگ پتھر پھینکیں لیکن جب نتائج سامنے آئیں تب ہر شخص کی آنکھ کھلتی ہے کہ واقعی اس شخص نے مدبرانہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ ہر بات کو اس طرح برملا کہنے کے عادی تھے کہ میں انہیں منہ پھٹ آدمی سمجھتا تھا لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ انہوں نے تمام مسائل میں صحیح رائے قائم کی اور جرأت سے حالات کا مقابلہ کیا۔

افغانستان میں روسی فوج کے داخل ہونے کے نتیجہ میں جب مہاجرین کا ریلا آیا تو میں نے بھی گھبرا کر یہ کہا کہ یا اللہ العالمین! اگر یہ سیلاب اسی طریقہ سے آتا رہا تو پھر ہمارا اپنا بیڑا غرق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ضیاء صاحب کی رائے یہ تھی کہ گھروں سے نکلے ہوئے جو مسلمان ہماری پناہ ڈھونڈ رہے ہیں ہم ان کو رد نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں پناہ دیں گے۔ اس رائے کے باعث ان پر جو تنقیدیں ہوئیں، اس کے جو مضمرات بیان کیے گئے، سپر پاور کی طرف سے جن خطرات کی نشاندہی کی گئی، وہ نہایت پریشان کن تھے لیکن میں نے ضیاء صاحب کو کبھی ڈرتے نہیں پایا۔ وہ اپنے موقف پر اس وقت تک ڈٹے رہے جب تک روس نے افغانستان میں ڈگ نہیں ڈال دی۔ ان کی یہ رائے درست تھی کہ اگر مجاہدین کو معاہدہ کا فریق نہیں بنایا جائے گا تو جھگڑا اسی طرح برقرار رہے گا چنانچہ اب ہم اسی مشکل سے دوچار ہیں۔

ایران عراق جنگ کو انہوں نے ہمیشہ دو بھائیوں کی جنگ قرار دیا اور ان میں صلح کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ایران نے اس بات کو نہیں مانا اور اصرار کرتا رہا کہ پہلے جارح کا تعین کیا جائے۔ ضیاء صاحب اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس کا انہوں نے برملا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن اس وقت اقوام متحدہ کی نگرانی میں جو جنگ بندی ہوئی ہے وہ اسی طرح ہوئی ہے جس طرح ضیاء صاحب کروانا چاہتے تھے۔

ایٹم بم کے حساس معاملے میں انہوں نے امریکہ کو ناراض نہیں کیا لیکن اس کے باوجود پاکستان کے موقف کو کمزور نہیں ہونے دیا۔ وہ ڈٹ کر کہتے رہے کہ ہم یک طرفہ طور پر اپنے ری ایکٹروں کی نگرانی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایٹمی صلاحیت حاصل کرنا ہمارا حق ہے اور ہم اس میں خاص پیش رفت

بھی کر چکے ہیں۔ اس معاملہ میں ضیاء صاحب نے کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ اس زمانہ میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی ملک سپر پاورز سے آزاد رہ سکے۔ ضیاء صاحب نے ایک سپر پاور کو ذلت کی شکست دینے کے بعد دنیا چھوڑی ہے اور دوسری سپر پاور سے بھی لیا ہے، ان کو دیا کچھ نہیں۔

بھارت کی سیاست نہایت فتنہ سیاست ہے۔ اس میں وقار ہے نہ شرافت۔ لیکن ہمارے لیڈر نے شروع سے ہی ایک باوقار روش رکھی جس کے نتیجے میں ہمیں کسی نے زیادتی کا الزام نہیں دیا۔ خود اہل بھارت کو اپنی حکومت سے شکایت ہے کہ اس کی سیاست طفلانہ ہے۔ آخری وقت میں مرارجی ڈیسائی کو نشان پاکستان دے کر انہوں نے بھارت پر ایک بھرپور وار کیا جس کی شدت کو ہر سمجھدار آدمی نے محسوس کیا۔

ہماری ملکی سیاست بڑے نازک دور سے گزری ہے۔ اس میں ان کے اقدامات سے مجھے بھی اختلاف رہا ہے لیکن سیاسی ذمہ داری اصلاً ضیاء صاحب کے کندھوں پر تھی۔ ان کے سامنے ہر کام کا ایک نقشہ ہوتا ہے اور وہ اسی نقشہ کے مطابق کام کرتے تھے۔ مثلاً بعض لوگوں کو انہوں نے مؤلفۃ القلوب کے زمرہ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ان کی تالیف قلب کے لیے ہر جائز طریقہ اختیار کرتے رہے۔ ان کے اقدامات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملکی معاملات میں کسی چیز سے غافل نہ تھے۔ انہوں نے تمام مخالفتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کوئی ایسا فیصلہ کر کے دنیا سے نہیں گئے جس سے ہمیں کوئی الجھن ہو۔ اگر کسی مسئلہ میں کچھ الجھن باقی رہ گئی ہے تو اس کو سلجھانے کا سررشتہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک بڑے لیڈر کے اندر وہی خوبیاں ہوتی ہیں جو ضیاء صاحب میں تھیں۔ باقی رہ گئے وہ لوگ جو لیڈری کے مدعی ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک تو ہم نے ان کا کچھ دیکھا نہیں۔ جن کو دیکھا ہے ان کا وہی معاملہ پایا کہ

چوں دم بر داشتم دیدم کہ مادہ !

مسلمان حکمرانوں میں شاہ فیصل مرحوم کا ایک بین الملی مقام تھا۔ ان کی پیشانی کی شکنیں ملت کے افکار کی شکنیں تھیں۔ وہ بڑے مدبر اور مسلمان ممالک کے سرپنچ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے بعد یہ ضیاء صاحب ہی تھے جو اپنے تدبر اور دانشمندی سے ملت کے سرپنچ کا مقام حاصل کر سکے۔ تمام معاملات پر ان کی نظر تھی۔ تمام مسلم ممالک کو ان کے فہم و بصیرت اور خلوص و دانشمندی پر بہت اعتماد تھا۔ بین الاقوامی طور پر بھی وہ اپنا مقام رکھتے تھے اور اس کا اندازہ امریکہ، برطانیہ بھارت اور یو این او کے کئی ممالک کے سربراہوں کے بیانات سے ہوتا ہے وہ ہمارے ملک کا

فخر تھے اور قوم و ملک کے لیے عزت اور سرفرازی کا ایک موثر ذریعہ تھے۔

آئیے اس غازی اور شہید مرد حق کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح پر فتوح پر اپنی رحمتیں، برکتیں، عنایتیں اور افضال نازل فرمائے، انہوں نے جو نیکیاں کی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے اور اگر ان سے کوتاہیاں ہوئی ہیں تو ان کو معاف فرمائے، ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور رضا بالقضا کی توفیق عطا فرمائے اور اس ملک کے حق میں یہ بظاہر جو بڑا شر نظر آتا ہے اس میں سے خیر نمایاں فرمائے۔ آمین۔

(ترتیب : خالد مسعود)

بقیہ : تفسیر سورۃ انعام (۱)

کرتے تھے ؀ پھر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا[۱۳] مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے ؀ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور ان کا سارا افترا ہوا ہو گیا ؀ ۲۴

---

۱۳ یعنی جس فتنۂ شرک اور جن جھوٹی اور موہوم آرزوؤں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کے پردے اٹھ جائیں گے اور ان کو نظر آ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے ہیں وہ محض فریب تھے۔ اس وقت ان کو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آئے گا کہ جس طرح آج خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اسی طرح جھوٹ بول شرک کا انکار کریں گے۔

تفسیر سورۃ انعام (۱)

شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے، جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں اور روشنی کو، پھر تعجب ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۱۔ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت ٹھہرائی اور مدت مقررہ اسی کے علم میں ہے۲۔ پھر تعجب ہے کہ تم کج بحثیاں کرتے ہو! اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور وہی زمین میں بھی۔ وہ تمہارے خفیہ اور علانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ سو انہوں نے واضح حق کو بھی جھٹلا دیا جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو عنقریب اُس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۳۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا، جن کو ہم نے ملک میں

---

۱ یہ شرک پر اظہارِ تعجب ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے نکلی! کائنات کی متضاد چیزوں میں جو سازگاری پائی جاتی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کوئی عاقل کس طرح ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ مان سکتا ہے!۔

۲ مدت سے مراد وہ مدتِ حیات ہے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے اور مدتِ مقررہ وہ ہے جو آخرت میں خلق کے اٹھائے جانے کے لیے مقرر ہے۔

۳ واضح حق سے مُراد قرآن مجید ہے۔ کفار جس چیز کا مذاق اڑا رہے تھے وہ پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں عذاب کی دھمکی تھی۔ فرمایا کہ اس کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

وہ قوت و سطوت دے رکھی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں، جو ان کے نیچے بہتی تھیں۴، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔

اور اگر ہم تم پر کوئی ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے جب بھی یہ کفر کرنے والے یہی کہتے کہ یہ بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اس پر علانیہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس معاملے کا فیصلہ ہی ہو جاتا، پھر ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۵۔ اور اگر ہم اس کو کوئی فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ پیدا کر رہے ہیں، ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے۶۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا، تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اُسی چیز نے آ گھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کہو، ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۷۔

---

۴ بارش کی کثرت رزق و فضل کی کثرت کی تعبیر ہے۔ جن اقوام کی ہلاکت کا ذکر کرکے اوپر کے دعوی پر تاریخ کی شہادت پیش کی ہے ان کی تفصیل اگلی سورہ الاعراف میں آئے گی۔

۵ ایمان وہ معتبر ہے جو غیب میں رہتے، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے جن کی انبیاء دعوت دیتے ہیں، نہ کہ وہ جو کشفِ حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔ فرمایا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ فرشتے علانیہ اترنے لگیں تو پھر اللہ کا عذاب آ دھمکے گا، پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔

۶ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لئے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان رسولوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب رسول انسان ہی کے روپ میں آتا تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جو اب اٹھا رہے ہیں۔

۷ یہ اشارہ ہے قوم عاد، ثمود، مدین وغیرہ کی طرف جن کی سرگزشتیں سورہ اعراف میں تفصیل سے بیان ہوں گی۔ ان قوموں نے بھی رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا اور آنے والے عذاب کی پروا نہ کی، بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گیا اور مذاق کرنے والے تباہ ہو گئے۔

ان سے پُوچھو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وُہ کس کا ہے؟ کہہ دو اللہ ہی کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شُبہ نہیں[۸]۔ جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے ۝ اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جو چیز شب میں ساکن ہوتی ہے اور جو دن میں متحرک ہوتی ہے اور وہ سمیع و علیم ہے ۝ ۱۳

کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وُہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں[۹]، کہہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو۔ کہہ دو کہ اگر میں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جو شخص اس دن اس سے دُور رکھا گیا درحقیقت وہی ہے جس پر خُدا نے رحم فرمایا اور یہی کھُلی کامیابی ہے ۝ ۱۶

اور اگر اللہ تجھُ کو کسی دُکھ میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی نہیں، جو اس کا دُور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز[۱۰] پر قادر ہے ۝ اور وہ اپنے بندوں پر پُوری طرح حاوی ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے ۝ پوچھو شہادت کے لیے سب سے بڑا کون ہے؟ کہو اللہ! وُہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے

---

۸ خدا نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ تمہیں پیدا کر کے اور پرورش کے تمام اسباب فراہم کر کے یونہی شترِ بے مہار بنا کے نہ چھوڑ دے بلکہ ضروری ہے کہ وہ تم سب کو کشاں کشاں روزِ قیامت کی طرف لے جائے۔ اگر قیامت نہ آئے تو یہ دُنیا ایک اندھیر نگری ثابت ہوتی ہے جو رحمٰن و رحیم خُدا کی شان کے بالکل منافی ہے۔

۹ یعنی مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا عدم سے وجود میں لانے والا بھی ہے اور جس کے فضل و کرم سے سب کو روزی بھی مل رہی ہے نہ کہ تمہارے وہ اصنامِ خیالی جو نہ کسی کے خالق اور نہ پروردگار ہیں؛ بلکہ تمہارے تصوّر کے مطابق حلوے مانڈے پیش کرنے سے راضی و آسودہ ہوتے ہیں۔

۱۰ یہاں خطاب لفظاً بصیغۂ واحد ہے لیکن مراد عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خُدا ہی کے اختیار میں ہیں تو پھر کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے اور کسی اور سے دعا و استرحام کی ضرورت کیا باقی رہی!

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعے سے تم کو ڈراؤں اور وُہ بھی جن کو یہ پہنچے۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خُدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہہ دو، وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں ان سے بری ہوں، جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو[۱۱] ۝ ۱۹

مضمونِ سورہ: توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی مسائل پر بحث اور اصلِ دینِ ابراہیمؑ کی وضاحت بنائے استدلال عقل و فطرت، آفاق و انفس کے شواہد اور اہلِ عرب کے مسلمات پر ہے۔

جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے ۝ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی۔ بیشک یہ ظالم فلاح پانے والے نہیں ۝ یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر پوچھیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان

---

۱۱ یعنی خُدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، اس معاملے میں فیصلہ کُن گواہی خود خُدا ہی کی ہو سکتی ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ اُس نے اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو وہ کون کون ہیں اور وہ کس نوعیت کے شریک ہیں۔ اگر اس نے کسی کا شریک ہونا تسلیم نہیں کیا ہے تو تم کو یا کسی کو کیا حق ہے کہ کسی کو اس کی خدائی میں حصہ دار بنائے۔ مجھے خدا کا حکم یہی ہے کہ میں اعلان کروں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک گردانتے ہو۔

۱۲ مراد صالحین اہلِ کتاب ہیں۔ جس طرح ایک مہجور باپ کو اپنے موعود و منتظر بیٹے کا انتظار ہوتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نویدِ مسرت لاتی ہے اسی طرح صالحین اہلِ کتاب کو قرآن اور پیغمبرؐ کا انتظار تھا۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

نمازوں کے اوقات (۴)

مؤطا امام مالک کی کتاب وقوت الصلوٰۃ کی احادیث

۲۳ — وحدثنی عن مالک عن یحیی بن سعید انّه کان یقول: انّ المصلّی لیصلّی الصلٰوۃ وما فاته وقتها. ولما فاته من وقتها اعظم او افضل من اهله وماله۔

□ ... یحییٰ بن سعید کہتے تھے کہ نمازی نماز پڑھتا ہے درآنحالیکہ اس کا وقت گزرا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس کا جو وقت گزر چکا ہوتا ہے وہ اس کے اہل وعیال اور مال سے زیادہ قیمتی یا زیادہ افضل ہوتا ہے۔

یحییٰ بن سعید کے قول کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے معاملے میں سہل انگاری روا نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ابھی بہت سا وقت پڑا ہوا ہے نماز پڑھ لی جائے گی۔ نماز اگرچہ آپ وقت کے اندر پڑھیں گے، لیکن آپ نے جو وقت کھویا ہے وہ آپ کے اہل وعیال اور مال کی مشغولیتوں سے زیادہ افضل ہے۔

وقت کو نتائج میں بڑا دخل ہے۔ مثلاً ایک عامی کاشت کار بھی یہ جانتا ہے کہ گندم بونے کا ایک اوسط وقت ہوتا ہے، ایک مؤخر وقت ہوتا ہے اور ایک بہترین وقت ہوتا ہے۔ کامیاب کسان وہ ہے کہ جو یہ جانے کہ گندم بونے کا بہترین وقت کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بوائی کے وقت سے حاصل پر فرق بہت پڑتا ہے۔ جس طریقے سے ہماری مادی دنیا میں یہ قاعدہ جاری ہے اسی طریقہ سے

روحانی دنیا میں بھی اوقات، موسم اور زمانے میں اس کا لحاظ ضروری ہے۔ ادائیگیٔ فرض کے معاملے میں یہ رویہ درست نہیں ہوتا کہ ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح وہ وقت گزر جائے جو اجر وثواب میں آپ کے اہل وعیال اور مال سے زیادہ قیمتی اور افضل ہو۔

۲۴ — وحدثنی عن مالک عن نافع انّ عبد الله بن عمر اُغمی علیه فذهب عقله. فلم یقض الصلٰوۃ۔

□ ... نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ایک مرتبہ بے ہوشی ہوگئی اور ان کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ تو انہوں نے اس دوران کی نماز ادا نہیں کی۔

یہ روایت مرفوع حدیث نہیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل ہے۔ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس پر امام مالک نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ہماری رائے میں حضرت ابن عمرؓ جب ہوش میں آئے تو نماز کا وقت گزر چکا تھا اس لیے انہوں نے وہ نماز نہیں پڑھی۔ اگر ایک شخص نماز کے وقت میں ہوش میں آجائے گا تو وہ نماز ادا کرے گا۔

یہ مسلک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ کسی شخص پر اگر طویل بے ہوشی کا دورہ پڑا ہو تو اس بات کا جواز ہوسکتا ہے کہ وہ اتنے عرصہ کی فوت شدہ نمازوں کا اعادہ نہ کرے، کیونکہ احکام کا اطلاق ایک ذی ہوش آدمی پر ہوتا ہے۔ لیکن وقتی بے ہوشی کی صورت میں آدمی کو نماز قضا پڑھنی چاہیے اگرچہ اس کا صحیح وقت نکل گیا ہو۔

۲۵ — حدثنی یحیی عن مالک عن ابن شهاب عن سعید بن المسیب انّ رسول الله صلّی الله علیه وسلّم حین قفل من خیبر اسرٰی حتّی اذا کان من آخر اللیل عرّس. وقال لبلال: اِکلأ لنا الصبح. ونام رسول الله صلّی الله علیه وسلّم واصحابه. وکلأ بلال ما قُدّر له. ثمّ استند الی راحلته وهو مقابل الفجر. فغلبته عیناه. فلم یستیقظ رسول الله صلّی

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا بِلَالٌ وَلَا اَحَدٌ مِّنَ الرَّكْبِ، حَتّٰى ضَرَبَتْهُمُ الشَّمْسُ - فَفَزِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فَقَالَ بِلَالٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَخَذَ بِنَفْسِي الَّذِيْ اَخَذَ بِنَفْسِكَ - فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِقْتَادُوْا ! فَبَعَثُوْا رَوَاحِلَهُمْ وَاقْتَادُوْا شَيْئًا - ثُمَّ اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَالًا فَاَقَامَ الصَّلٰوةَ فَصَلّٰى بِهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصُّبْحَ - ثُمَّ قَالَ، حِيْنَ قَضَى الصَّلٰوةَ : مَنْ نَسِيَ الصَّلٰوةَ فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ فِيْ كِتَابِهٖ: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ.

□ ... سعید ابن مسیّب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت خیبر سے لوٹے تو رات کا سفر کیا۔ یہاں تک کہ آخر شب میں آپ ذرا استراحت کے لیے اترے اور بلالؓ سے فرمایا کہ ذرا ہمارے لیے صبح کا خیال رکھیو! اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سو گئے اور آپ کے اصحاب بھی۔ بلالؓ نے، جتنی دیر تک اللہ نے چاہا، نگرانی کی۔ پھر انہوں نے کجاوے سے ذرا ٹیک لگائی اور اپنا رخ مشرق کی جانب کر لیا۔ اس پر ان کی آنکھ لگ گئی۔ پھر جب تک دھوپ نہیں پڑی نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاگے، نہ بلالؓ اور نہ قافلے کا کوئی اور شخص۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا گئے۔ بلالؓ نے عرض کی: یارسول اللہ! وہی چیز جو آپ کو لاحق ہوئی مجھے بھی لاحق ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، کوچ کرو۔ لوگوں نے اپنے کجاوے اٹھائے، سواریوں پر رکھے اور کچھ دور چلے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو حکم دیا تو انہوں نے نماز کے لیے اقامت کرائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی۔ جب نماز ہو چکی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص نماز پڑھنا بھول گیا ہو تو چاہیے کہ جب اسے یاد آئے تو وہ نماز پڑھ لے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ میرے ذکر کے لیے نماز کا اہتمام رکھو۔

یہ روایت یہاں مرسل بیان ہوئی ہے، امام مسلم نے اس کو حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے موصول کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: صحیح مسلم: کتاب المساجد ومواضع

الصلوٰۃ، باب ۵۵-

قَفَلَ: سے مطلب ہے رجوع۔ یہ لفظ روانگی کے لیے نہیں آئے گا۔

'حین قفل من خیبر': اس امر میں محدثین میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ اس کا موقع خیبر سے واپسی ہے یا حنین سے یا کسی اور مہم سے؟ بعض لوگوں نے ان مختلف رایوں میں تطبیق یہ کہہ کر کی ہے کہ یہ مختلف مواقع کی بات ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اسے مختلف مواقع کی بات کہنا سہل انگاری کے ساتھ بات کو ٹالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے امور میں مقامات وغیرہ کے بیان میں ہر راوی زیادہ احتیاط نہیں کرتا کیونکہ بالعموم اس کا مسئلے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کی اصل مسئلے کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہ ہو خواہ مخواہ وہ اس کی یادداشت کو اپنے لیے بار نہیں بناتا۔ وہ جیسا کچھ یاد پڑے روایت کر دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیبر ہی کے موقع کا واقعہ ہے جیسا کہ اس روایت میں تصریح ہے۔

'وھو مقابل الفجر': یعنی ان کا رخ اس طرف تھا جس طرف سے فجر طلوع ہوتی ہے یعنی مشرق۔ اور یہ انداز پہرے پر کھڑے سپاہی کے انداز سے ملتا جلتا تھا۔

'فاقام الصلوٰۃ': اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلالؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں فقط نماز کے لیے اقامت کرائی، اذان نہیں دی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ راوی نے اذان کا ذکر چھوڑ دیا ہو۔ اس باب میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ اگر آدمی سفر میں اکیلا ہے تو اذان کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اقامت کافی ہے اور اگر قافلہ ہے تو اذان اور اقامت دونوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مسلک بھی اس سلسلے میں اذان اور اقامت دونوں کا ہے۔ تبلیغ و دعوت کے نقطۂ نظر سے دونوں کا اہتمام واجب ہے۔

'ففزع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم': یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے اصل وقت کے فوت ہو جانے پر پریشان ہو گئے۔ شارحین نے اس فطری گھبراہٹ پر جو سب سے قیمتی متاع کے کھو جانے پر آپ کو لاحق ہوئی، بے مقصد حاشیہ آرائی کی ہے۔ اس لیے کہ روایت میں واضح طور پر موجود ہے کہ گھبراہٹ یہ تھی کہ نماز کا وقت گزر گیا اور ہم سوتے رہے۔

'فان اللہ .... لذکری': روایت کے اس حصے میں راویوں کا اختلاف ہے۔ ایک روایت میں للذکریٰ کے الفاظ آئے ہیں۔ جو ظاہر ہے قرآن مجید کے الفاظ نہیں ہیں۔ بعض

محدثین کے نزدیک یہ راوی کی طرف سے تصحیف ہے۔ یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کا مفہوم وہ نہیں جس کو ادا کرنے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے۔ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ نماز کا اہتمام میری یاد کے لیے کرو۔ یعنی اللہ کی یاد کا مثالی طریقہ یہ ہے کہ آدمی نماز کا اہتمام کرے۔ ان الفاظ کے یہ معنیٰ کسی طرح نہیں لیے جا سکتے کہ نماز یاد آنے پر پڑھو، جو حدیث کا تقاضا معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کسی راوی نے یہ الفاظ بڑھائے ہیں، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا، اور یہ موطا کے رواۃ میں سے ہوں گے۔

۲۶ — وحدثنی عن مالك عن زيد بن اسلم اَنَّهُ قَالَ: عَرَّسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً بِطَرِيْقِ مَكَّةَ وَ وَكَّلَ بِلَالًا اَنْ يُّوْقِظَهُمْ لِلصَّلٰوةِ۔ فَرَقَدَ بِلَالٌ وَرَقَدُوْا، حَتّٰى اسْتَيْقَظُوْا وَقَدْ طَلَعَتْ عَلَيْهِمُ الشَّمْسُ۔ فَاسْتَيْقَظَ الْقَوْمُ وَقَدْ فَزِعُوْا۔ فَاَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّرْكَبُوْا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِيْ۔ وَقَالَ: اِنَّ هٰذَا وَادٍ بِهٖ شَيْطَانٌ۔ فَرَكِبُوْا حَتّٰى خَرَجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِيْ۔ ثُمَّ اَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنْزِلُوْا وَاَنْ يَّتَوَضَّؤُوْا۔ وَاَمَرَ بِلَالًا اَنْ يُّنَادِيَ بِالصَّلٰوةِ اَوْ يُقِيْمَ۔ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ۔ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلَيْهِمْ وَقَدْ رَاٰى مِنْ فَزَعِهِمْ۔ فَقَالَ: يٰاَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا وَلَوْ شَآءَ لَرَدَّهَا اِلَيْنَا فِيْ حِيْنٍ غَيْرِ هٰذَا۔ فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ نَسِيَهَا ثُمَّ فَزِعَ اِلَيْهَا فَلْيُصَلِّهَا كَمَا كَانَ يُصَلِّيْهَا فِيْ وَقْتِهَا۔ ثُمَّ الْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ فَقَالَ: اِنَّ الشَّيْطَانَ اَتٰى بِلَالًا وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فَاَضْجَعَهٗ فَلَمْ يَزَلْ يُهَدِّئُهٗ كَمَا يُهَدَّاُ الصَّبِيُّ حَتّٰى نَامَ۔ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَالًا۔ فَاَخْبَرَ بِلَالٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ الَّذِيْ اَخْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَا بَكْرٍ۔ فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ: اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔

□ ... زید بن اسلم سے روایت ہے کہ مکہ کے راستے میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر شب میں آرام کے لیے اترے اور بلالؓ کو مامور فرمایا کہ لوگوں کو نماز کے لیے جگا دیں۔ بلالؓ کو نیند آگئی اور دوسرے لوگ بھی سوتے رہے یہاں تک کہ اس وقت جاگے جب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ لوگ گھبرائے ہوئے اٹھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ اپنی سواریوں پر سوار ہوں یہاں تک کہ اُس وادی سے نکل جائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وادی میں کوئی شیطان ہے۔ لوگ سوار ہو کر وادی سے نکل گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اترنے اور وضو کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لیے اذان دیں یا اقامت کہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ پھر آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو ان پر گھبراہٹ کے آثار دیکھے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ ہی نے ہماری روحوں کو قبض کیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو وہ اس کے بجائے دوسرے وقت میں ان کو ہماری طرف پلٹا دیتا۔ تو جب ایسا ہو کہ تم میں سے کوئی نماز سے غافل ہو جائے یا بھول جائے اور گھبرا کر اس کے لیے اٹھے تو چاہیے کہ وہ نماز اسی طرح پڑھے جس طرح وہ نماز کو اس کے وقت کے اندر پڑھتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ شیطان بلالؓ کے پاس آیا جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو اس نے ان کو ذرا لٹا دیا۔ پھر وہ ان کو تھپکیاں دیتا رہا جس طریقے سے بچے کو تھپکیاں دی جاتی ہیں تو وہ سو گئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو بلایا تو انھوں نے آپ کو ویسی ہی بات بتائی جیسی آپ نے ابوبکرؓ سے بیان کی تھی۔ اس پر ابوبکرؓ پکار اٹھے: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

يُهَدِّئُهٗ: هَدَّاَ سے مراد تسکین دینا ہے جس طرح سے روتے بچے کو ماں پرسکون کرنے کے لیے تسکین دیتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ صبح کے وقت جب جاگنے کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت شیطان خاص طریقے پر تھپکی دیتا ہے کہ میاں، ابھی بہت سویرا ہے، ذرا اور سو لو۔ آدمی اسی میں مار کھا جاتا ہے۔ اور وقتوں میں یہ بات نہیں ہوتی۔

اس روایت میں کوئی بات اوپر والی روایت کے خلاف نہیں ہے، البتہ کچھ تفصیل ہے۔

لیکن اس کے الفاظ اتنے گٹھے ہوئے، بچے تلے اور کانٹے کی تول نہیں ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ یہ راوی نے واقعہ بیان کیا ہے، یہ روایت مرفوع نہیں ہے۔

اوپر والی روایت میں 'خیبر' ہے اس میں 'بطریق مکہ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کی تاویل یوں ہو سکتی ہے کہ خیبر سے آتے ہوئے آپؐ مکہ کے راستے میں تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔

'اِنَّ ھٰذا وادٍ بہ شیطان': 'اس وادی میں کوئی شیطان ہے' یہ بات نماز سے غفلت کی تعبیر ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہر غفلت کی تعبیر ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر غفلت کے کام میں شیطان کو دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ مشخص طریقے پر وادی میں کوئی شیطان ہی ہو۔ ویسے بھی اگر کسی جگہ شیطان موجود ہو تو اس سے بھاگنا مسئلہ کا حل نہیں ہوتا بلکہ اس صورت میں خدا کی یاد میں اضافہ کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ مردود وہاں سے بھاگ جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ آگے چلنے کا حکم دینے میں کیا مصلحت تھی تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رستہ آپ کا جانا پہچانا تھا، آپؐ نے محسوس فرمایا کہ فلاں جگہ ٹھہرنے اور نماز پڑھنے میں قافلے کے لیے زیادہ سہولت ہوگی۔

'وامر بلالاً ان ینادی بالصلوٰۃ او یقیم': راوی کو یہاں شبہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان اور اقامت دونوں کا حکم فرمایا یا صرف اقامت کا۔ راوی نے اس شبہے کو ظاہر کر دیا ہے۔

'اِنَّ اللّٰہ... فی رقتھا': مسلمانوں کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے آپ نے یہ تسلی دی کہ نیند میں ایک طرح قبضِ ارواح ہوتا ہے جو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس نے بیدار نہیں کیا تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے یہ اسی کی مشیت سے ہوا ہے۔ جب اس طرح کا موقع پیش آ جائے اور نماز سے غفلت ہو جائے یا نیند آ جائے تو دوسرے وقت جب جاگو تو پڑھ لو اور اس امر کا اہتمام رہے کہ دوسرے وقت میں نماز اسی طریقہ سے پڑھی جائے جس طرح سے کہ اصل وقت میں پڑھی جاتی ہے۔

۲۷ــــ حَدَّثَنِیْ یَحیٰی عن مالک عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ شِدَّۃَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ فَاِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا عَنِ الصَّلَاۃِ. وَقَالَ: اِشْتَکَتِ النَّارُ اِلٰی رَبِّھَا فَقَالَتْ: یَارَبِّ! اَکَلَ بَعْضِیْ بَعْضًا. فَاَذِنَ لَھَا بِنَفَسَیْنِ فِیْ کُلِّ عَامٍ: نَفَسٍ فِی الشِّتَآءِ وَ نَفَسٍ فِی الصَّیْفِ۔

□ ... عطاء ابن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک میں سے ہے تو جب گرمی شدید ہو تو نماز سے الگ رہ کر، ٹھنڈے میں رہو۔ اور آپ نے ساتھ ہی یہ بات بھی فرمائی کہ دوزخ نے اپنے خداوند سے یہ شکایت کی۔ اس نے کہا کہ اے خداوند! میرے بعض نے بعض کو کھا لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سال میں دو سانس لینے کی اجازت دی: ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔

۲۸ــــ وحدثنا مالک عن عبد اللّٰہ بن یزید، مولی الاسود بن سفیان عن ابی سلمۃ بن عبد الرحمٰن وعن محمد بن عبد الرحمٰن بن ثوبان عن ابی ھریرۃ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا عَنِ الصَّلَاۃِ. فَاِنَّ شِدَّۃَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ. وَذَکَرَ اَنَّ النَّارَ اشْتَکَتْ اِلٰی رَبِّھَا فَاَذِنَ لَھَا فِیْ کُلِّ عَامٍ بِنَفَسَیْنِ: نَفَسٍ فِی الشِّتَآءِ وَنَفَسٍ فِی الصَّیْفِ۔

□ ... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب گرمی شدید ہو تو نماز سے الگ رہ کر، ٹھنڈے میں رہو، بے شک گرمی کی شدت جہنم کی پھونک میں سے ہے اور اس کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دوزخ نے اپنے خداوند سے یہ شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سال میں دو سانس لینے کی اجازت دی: ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔

یہ روایت صحیح بخاری ــــ کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۹ ــــ اور صحیح مسلم ــــ کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب ۳۲ ــــ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

۲۹ــــ وحدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا اشْتَدَّ

الْحَرُّ فَأَبْرِدُوْا عَنِ الصَّلَاةِ۔ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ۔

□ ... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب گرمی شدید ہو تو نماز سے الگ رہ کر، ٹھنڈے میں رہو۔ بے شک گرمی کی شدت جہنم کی پھونک میں سے ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری ــــ کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۹ ــ اور صحیح مسلم ــــ کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب ۳۲ ــــ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

روایات ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ کا مضمون ایک ہی ہے۔

'فابردوا عن الصلوٰۃ' سے مطلب یہ ہے کہ جب گرمی سخت ہو تو نماز سے ہٹ کر ٹھنڈے میں رہو۔ یعنی اس وقت نماز کو اپنے ساتھ گرمی میں نہ ڈال دو۔ 'عن' کسی چیز سے دور ہونے اور بچنے کے معنی میں آتا ہے۔

یہی روایت دوسری جگہ 'فابردوا بالصلوٰۃ' سے بھی آئی ہے اور وہ روایت بھی ٹھیک ہے۔ اس کے معنی بعض لوگوں نے یوں کر دیے کہ یہ دوزخ کی گرمی ہے اس کو نماز کے ذریعے سے ٹھنڈا کرو۔ ظاہر ہے کہ اس سے مطلب بالکل الٹ ہو گیا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ نماز کے ذریعے سے گرمی کی سرکوبی کرو۔ یعنی ٹھیک دوپہر میں نماز پڑھو۔ لیکن یہ بات مسلّمہ کے خلاف ہے اس لیے کہ مسلم سنت یہ ہے کہ گرمی کی شدت میں نماز کو مؤخر کر کے پڑھنا چاہیے۔

عربیت کے لحاظ سے بھی 'ب' کے ساتھ یہ معنی لازم نہیں نکلتے۔ 'ب' معیّت کے معنی میں آتا ہے لہٰذا معنی ہوں گے: 'نماز کے ساتھ ٹھنڈے میں رہو'، یعنی نماز کو اس آگ میں جھونکو نہ اپنے کو۔

آگے فرمایا کہ 'گرمی کی شدت جہنم کی پھونک میں سے ہے'۔ اس کی وضاحت کے لیے دوزخ کی شکایت بیان ہوئی ہے کہ اس نے اپنے خداوند کے حضور التجا کی کہ یں تو جل بھنی: 'اکل بعضی بعضاً'، میرے تو بعض اجزاء نے دوسرے اجزاء کو کھا لیا۔ میرے لیے کوئی راستہ نکال دیجیے کہ اس گرمی سے نجات ملے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دو سانس لینے کی اجازت دی: ایک گرمی

میں اور ایک سردی میں۔ چنانچہ وہ موسمِ گرما کی لُو اور موسمِ سرما کی زمہریر میں ان دو سانسوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔

اب یہ بات بطور تشبیہ اور مجاز کے ہے یا حقیقت ہے تو اس بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ بہت سے لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ بطور تشبیہ ہے۔ یعنی ایک حقیقت کو سمجھانے کے لیے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے کہ وہاں دوزخ میں گرمی کی یہ شدت ہوگی کہ وہ بھی چیخ اٹھے گی اور وہ جو سانس لیتی ہے تو اس کا اثر یہاں تک پہنچتا ہے۔

ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جتنی بھی دکھ اور تکلیف کی چیزیں ہیں ان سب کا اصل منبع دوزخ ہے اور جتنی سکون اور راحت کی چیزیں ہیں ان سب کا اصل منبع جنت ہے۔ البتہ ان کی اصل حقیقت کا پتا ان کے سزاوار لوگوں کو اس وقت چلے گا جب وہ ان میں پہنچیں گے۔ اس دنیا میں ہمیں جو چیز ملتی ہے وہ بہت سے وسائل و ذرائع سے ہوتی ہوئی ملتی ہے۔ دودھ ہی کو لے لیجیے۔ جنت میں جو غیر متغیّر دودھ ملے گا وہ اور دودھ ہوگا: 'وَأَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ' (محمد ۔ ۴۷ : ۵) (اور نہریں ہوں گی دودھ کی جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہوگا) اور یہاں جو دودھ ہمیں ملتا ہے وہ گوبر اور خون کے راستوں سے نچڑتا ہوا بنتا ہے: 'نُّسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا' (النحل ۔ ۱۶ : ۶۶) (ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں) ظاہر ہے اس دودھ اور اس دودھ میں بڑا فرق ہو جائے گا۔ اسی طریقے سے آپ کو جو شہد ملتا ہے وہ مکّھی کی قے ہوتی ہے اور اہلِ جنت کو جو شہد ملے گا نہ جانے کتنا مصفّیٰ ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس جتنی بھی تکالیف ہیں وہ بھی دوزخ میں اصل حالت میں ہیں۔ باقی رہ گیا ان کا کچھ نہ کچھ نمونہ تو کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں وہ دکھا دیا ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آپ دوزخ کی کیفیات کو کیسے سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح اگر نعمتوں کا تجربہ نہ کرایا جاتا تو آپ جنت کی کیفیات کا کیسے ادراک کر سکتے تھے۔ یہ چیز خود قرآن سے نکلتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب اہلِ جنّت کو نعمتیں عطا ہوں گی تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہیں جن سے ہم دنیا میں لذت آشنا ہوتے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ بے شک وہ ان سے ملتی جلتی تھیں: 'كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا' (البقرہ ۲: ۲۵) (جب جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں

عطا ہوا تھا اور ملے گا اس سے ملتا جلتا)۔

اس موقع پر آپ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جنت اور دوزخ، دونوں کا کچھ نہ کچھ اندازہ کرنا ہر شخص کے لیے واجب تھا اس لیے کہ تمام صلاح اور فلاح کا انحصار اسی پر ہے۔ جنت کی نعمتوں سے آپ بالکل اجنبی اور ناآشنا ہوں تو ان کے لیے آپ کے اندر رغبت اور شوق نہیں ہو سکتا۔

جہنم سال میں دو مرتبہ جو سانس لیتی ہے، تو یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ایک ہی ساتھ یکساں گرمی بھی پڑے اور ایک ہی ساتھ یکساں سردی بھی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خدا کے پیدا کیے ہوئے بہت سے عوامل کام کرتے ہیں۔ ہم بہرحال نظامِ شمسی سے منسلک کیے گئے ہیں اور موسموں کے تغیر و تبدل میں سمندر، جنگل اور خطِ استوا سے قرب و بعد وغیرہ بھی دخیل ہیں۔ یہ تمام چیزیں موسم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اگر اپنی بنائی ہوئی دوزخ سے کوئی بات پوچھے اور وہ جواب دے اور اگر دوزخ اپنے رب سے کوئی بات کہے تو اس میں تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ خود اپنے اوپر غور کر لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جسم کا ایک ایک رواں ناطق ہے۔ کتنی کیفیات ہیں کہ جو آپ کے روئیں روئیں سے واضح ہوتی ہیں۔ وہ خطرے، خوشی اور غم کے وقت کچھ نہ کچھ بات کہتا ہے لیکن بادی النظر میں ہم اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ جہنم سے ہم کلام ہوتا ہے اور وہ اس کا حکم مانتی ہے اور جہنم کچھ عرض کرنا چاہتی ہے تو خدا اس کو سنتا ہے۔ ہمیں یہ سب کچھ اس لیے سنائی نہیں دیتا کہ ہر چیز کی زبان الگ الگ ہے اور ہم اسے نہیں سمجھتے۔

بہرحال ہم اس حدیث کو نہ تو تشبیہ مانتے ہیں نہ مجاز بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کی حقیقی ضرورت یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں دوزخ کا نمونہ بھی دکھا دیا جائے اور علیٰ ہذا القیاس جنت کا نمونہ بھی۔ اس میں یار لوگوں نے خواہ مخواہ کی موشگافیاں کی ہیں۔

۳۰ — حدثنی یحییٰ عن مالك عن ابن شهاب عن سعید بن المسیب اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا یَقْرُبْ مَسَاجِدَنَا یُؤْذِیْنَا بِرِیْحِ الثُّوْمِ۔

□ ... سعید ابن مسیّب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اس پودے سے کھایا ہو تو وہ، ہمیں لہسن کی بُو سے تکلیف دیتا ہوا، ہماری مسجدوں کے قریب نہ پھٹکے۔

یہ روایت یہاں مرسل بیان ہوئی ہے۔ امام مسلم نے اسے حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے موصول کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: صحیح مسلم: کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب ۱۷۔

اس روایت کا تعلق مسجد کے آداب سے ہے۔ قربِ نماز کے وقت کسی بدبودار چیز جیسے لہسن وغیرہ کا کھانا ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اس باب میں یہ ہدایت ہے کہ ایسی چیزیں اتنی پہلے کھائیے کہ نماز تک اس کی بُو باقی نہ رہے۔ یہ ممانعت لہسن کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ اس قبیل کی ہر بدبودار چیز اس میں شامل ہے، مثلاً پیاز۔ ان چیزوں کی ناگوار بُو اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب ان کا استعمال کچی شکل میں کیا جائے۔ پکی شکل میں ان میں کسی قسم کی ناگوار بُو نہیں ہوتی یا وہ اتنی خفیف ہوتی ہے کہ ایذا کے حکم میں نہیں آتی۔

جن لوگوں نے یہ ذہانت دکھائی ہے کہ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص لہسن وغیرہ کھائے ہوئے ہو اس شخص کے لیے جماعت کی حاضری سے رخصت ہے بالکل غلط ہے۔ یہ نماز سے فرار کا بہانہ ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ بس لہسن کھا لیجیے اور اناشغفیل پڑ کے سو رہیے۔

۳۱ — وحدثنی عن مالك عن عبد الرحمٰن بن المُجَبَّر اَنَّهٗ كَانَ یَرَی سَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ اِذَا رَاَی الْاِنْسَانَ یُغَطِّیْ فَاهُ وَهُوَ یُصَلِّیْ جَبَذَ الثَّوْبَ عَنْ فِیْهِ جَبْذًا شَدِیْدًا حَتّٰی یَنْزِعَهٗ عَنْ فِیْهِ۔

□ ... عبد الرحمان ابن مجبّر سے روایت ہے کہ وہ دیکھتے تھے کہ سالم بن عبد اللہ جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ اپنا منہ ڈھانپے ہوئے نماز پڑھ رہا ہے تو وہ اس کے کپڑے کو زور سے جھٹکا دے کر کے اس کے منہ سے کھینچ لیتے یہاں تک کہ وہ اس کے منہ سے ہٹا دیتے۔

یہ بات بجائے خود مسلّم ہے کہ نماز میں منہ کو لپیٹ کر نہیں رکھنا چاہیے جیسا کہ دوسری روایات سے بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا ہے۔ لیکن امام مالک اس روایت کو لمس وغیرہ سے متعلق باب میں کیوں لائے ؟ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اس طرف گیا کہ حضرت سالم بن عبداللہ یہ خیال فرماتے رہے ہوں گے کہ یہ شخص جو منہ لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہا ہے ضرور لہسن کھائے ہوئے ہے ۔ وہ یہ چاہتے ہوں گے کہ جب یہ شخص یہ حرکت کر کے مسجد میں آ ہی گیا تو پھر اس کے لیے منہ ڈھانپنے کے کیا معنی ، سیدھے طریقے سے نماز ادا کرے ۔

(ترتیب : ماجد خاور)

بقیہ : حکیم کا طرزِ فکر و تعلیم

۴۔ قرآن نے علم و عمل کو دو الگ چیزیں نہیں رہنے دیا بلکہ دونوں کو باہم ملا دیا ہے اور ان دونوں پر ایک ساتھ زور دیا ہے ۔

۵۔ قرآن نے حکمت کے مقام ، اس کے آنے کے دروازوں اور اسباب سب کی طرف رہنمائی کی ہے ۔

۶۔ نظم و ترتیب کو تفکر کا سب سے بڑا داعیہ اور غور کے مختلف پہلوؤں کا مرکزی نقطہ قرار دیا ہے ۔

(گزشتہ سے پیوستہ) کو زیرِ بحث لاتا ہے : تاکہ قاری پر اگر ایک جگہ بات واضح نہیں ہوتی تو دوسری جگہ اس پر واضح ہو جائے ۔ مولانا فراہی کے نزدیک غور کرنے کا طریقہ بھی یہی ہونا چاہیے کہ آدمی دلیل کے ہر پہلو پر توجہ دے ۔

(مترجم)

حکمتِ قرآن (۵)

ختمِ نبوّت کی فلسفیانہ بنیاد

نظامِ نبوت کے متعلق اپنے مضمون میں مَیں نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ عقل میں اور نقل میں یا عقل میں اور وحی میں کوئی تضاد و تناقض ہے۔ میرے نزدیک عقل اور وحی دونوں توام ہیں ، دونوں خدا کی بہت بڑی نعمتیں ہیں اور ان دونوں میں کامل توافق ہے ۔ اگر ان میں بظاہر کہیں تناقض ہے تو غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یا تو کسی نقل کے سمجھنے میں یا عقل کا اصول قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے ۔ یہ رائے ابن تیمیہؒ کی ہے جسے تجربہ کے بعد میں نے بالکل ٹھیک پایا ہے ۔

اپنے مضمون میں مَیں نے یہ بھی بتایا تھا کہ مختلف اعتبارات سے عقل پر وحی کی رحمتیں اور برکتیں بہت زیادہ ہیں ۔ مثلاً وحی عقل کی تطہیر اور تزکیہ کر کے اس کو تمام اعلیٰ علوم کی نشوونما کے لیے موزوں کر دیتی ہے ۔ عقل بے تربیتی تحت مگراہی نارسائی خیالات سے مرعوبیت ، خوف و طمع یا سہل انگاری کے سبب سے غلط نظریات قائم کر لیتی یا غلط فیصلوں تک پہنچ جاتی ہے جو اس کو اعلیٰ علوم کی طرف سے غافل کر دیتے ہیں ۔ وحی ان تمام غلط چیزوں سے اس کو پاک و صاف کر کے کتاب و حکمت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں بنا دیتی ہے ۔ وہ آفاق و انفس کے دلائل کو روشن کر کے اس کی کمزوریوں اور ضلالتوں کو دور کر دیتی ہے ۔ اسی طرح وحی نہ عقل کی نفی کرتی ہے اور نہ اس سے متناقض کوئی چیز ہے بلکہ یہ عقل کی تکمیل کرتی ہے ۔ عقل حبِ عاجلہ کے سبب سے اپنے سارے اسلحہ اور اپنی ساری قابلیتیں بیشتر اسی دنیا کے دھندوں میں صرف کرتی ہے ۔ لیکن وحی آ کر اس کو بیدار کرتی اور اس کی قوت کو اتنا بڑھا دیتی ہے کہ وہ آخرت کے مسائل کو بھی سمجھنے لگتی ہے ۔ بلکہ للہ کے ایسے بندے بھی ہیں جن کی یہ صلاحیت اتنی قوت حاصل کرتی ہے کہ وہ دنیا کے مسائل کی نسبت زیادہ خوبی کے ساتھ آخرت کے مسائل کو سمجھتے ہیں ۔

عقل اور وحی کے اس تعلق اور وحی کی برکات پر جب غور کریں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وحی جب اتنی بڑی نعمت ہے اور اتنے گوناگوں پہلوؤں سے عقلِ انسانی کو اس سے فائدے پہنچتے ہیں اور

عقل کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے یہ ایک ناگزیر شے ہے تو آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے بعد وحی کی ہدایت اور انبیاء کی آمد کا سلسلہ ختم کیوں کر دیا گیا؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد وحی اور نبوت کا سلسلہ تو بے شک ختم کر دیا گیا لیکن یہ نہیں ہوا کہ نبوت کے مقاصد کے حصول کی طرف سے صرفِ نظر کر لیا گیا ہو۔ نظام نبوت کا اصل مقصد خلق کی ہدایت تھا۔ انبیاء زبانی تعلیم دیتے یا کوئی کتاب وحی پیش کرتے تو اس کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہوتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد خلق کی ہدایت کے اس مقصد کو مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کر دیا گیا۔ یہ اہتمام آفاقیت کے جلال، کاملیت کے جمال، محفوظیت کی شان اور ابدیت کی آن کے ساتھ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ یہ اجمالی جواب تفصیل کا محتاج ہے:

نبوّت کی آفاقیت:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے سلسلۂ نبوت کی نوعیت ایک طرح سے قومی نبوّت کی تھی۔

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورۃ رعد ۷) "ہر قوم کے لیے ایک ہادی"

کے اصول پر ہر قوم کی طرف الگ الگ نبی آتے، وہ لوگوں کو ہدایت کے راستے پر لانے کی کوشش کرتے۔ وہ دنیا سے رخصت ہوتے تو کچھ عرصہ بعد ان کی تعلیم بھی رخصت ہو جاتی۔ پھر اللہ تعالیٰ دوسرا نبی بھیجتا جو آ کر پھر سے قوم کو دین کی دعوت دیتا۔ قومی نبوّت کی یہ شکل اللہ تعالیٰ کی کسی مجبوری کی بنا پر اختیار نہیں کی گئی کیونکہ اس کو تو کوئی مجبوری لاحق نہیں ہوتی بلکہ یہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔ اس وقت تک دنیا ابھی اس مقام پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ ساری دنیا کو ایک مینار سے اذان یا ایک منبر سے دعوت دی جا سکتی۔ دنیا کے دریا، پہاڑ اور سمندر قوموں اور قوموں کے درمیان ایسے فاصل تھے کہ اس فاصلے کو قطع کر لینا اس زمانے کی قوموں کے لیے آسان نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے سے اس دور کا آغاز ہوا جس میں یہ فاصلے کم ہونے لگے، قوموں کا آپس میں میل جول بڑھا، کرۂ ارض کے انسان ایک کنبہ سمجھے جانے لگے اور آج یہ کیفیت ہے کہ دنیا ایک ہی مکان کے صحن کی مانند سمجھی جاتی ہے۔ انسانوں کے حالات میں اس تبدیلی کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت

میں بھی یہ تبدیلی ہوئی کہ قومی نبوت کے سلسلے کو ختم کر کے بین الاقوامی یا آفاقی نبوت قائم کر دی گئی تاکہ ایک ہی منبر سے ساری دنیا کو پکارا جائے۔ ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے عین مطابق تھا۔ تمام انسان جب اسی نے پیدا کیے، اس نے سب کی فطرت یکساں بنائی اور ان سب کو ایک ہی آدم کی نسل سے اٹھایا تو آخر وہ ان میں کامل یکسانی، کامل وحدت اور کامل توافق پیدا کرنے کا اہتمام کیوں نہ کرتا؟ اس کے لیے ضروری تھا کہ سب انسانوں کے لیے ہدایت کا ماخذ ایک ہی ہوتا اور ان سب کو ایک ہی مینار سے آواز دی جاتی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ کی بعثت دوہری ہے۔ ایک بعثتِ خاص دوسری بعثتِ عام۔ آپ کی بعثتِ خاص امیوں یعنی بنی اسماعیل یا دوسرے الفاظ میں عربوں کی طرف تھی، جیسا کہ قرآن نے واضح طور پر بیان کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (الجمعہ ۲) وہی ذات ہے جس نے اُمیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔

حدیث میں بھی آپؐ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ:

انی بُعثت الی امۃ امیین (جامع ترمذی۔ قرآن باب ۹) میں اُمّی لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔

یہ بعثتِ خاص گویا آپ کی قومی نبوت تھی۔ اس کے برعکس آپ کی بعثتِ عام تمام خلق کی طرف ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا ۲۸) اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی اس حیثیت کو خود بھی واضح فرمایا۔ آپ نے اپنی نبوت کی پانچ امتیازی خصوصیات بیان فرمائیں۔ ان میں سے ایک خصوصیت یوں تھی:

کان کل نبی یُبعث الیٰ قومہٖ خاصۃ وبُعثتُ الی الناس عامۃ (صحیح بخاری کتاب التیمم۔ حدیث ۲) پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف آتا تھا، مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔

پچھلے انبیاء اپنی اس حیثیت کو برملا واضح کر دیتے تھے کہ وہ صرف اپنی قوم کی اصلاح پر مامور ہیں۔ سابق انبیاء کے سلسلے کے آخری نبی سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنا مشن ان الفاظ میں

بیان فرمایا :۔

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا........ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کے آگے ڈال دینا اچھا نہیں"

(متی ۱۵ : ۲۴-۲۶)

سیدنا مسیح علیہ السلام کی مراد اس کلام سے یہ تھی کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت اور اصلاح پر مامور ہیں، وہ اپنی توانائی دوسری قوموں کی اصلاح میں صرف نہیں کر سکتے، ایسا کرنا بنی اسرائیل کی حق تلفی ہوگا۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو روشنی تھی وہ بنی اسماعیل کے لیے تو تھی ہی لیکن وہ باقی تمام خلق کے لیے بھی تھی، خواہ اس کا تعلق کسی بھی قوم، قبیلے یا نسل سے ہو۔ حضور تمام دنیا کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو تلاش کرنے پر مامور تھے۔

جہاں تک فرائض نبوت کے ادا کرنے کا تعلق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بعثتِ خاص کی ذمہ داری سے بنفسِ نفیس عہدہ برآ ہوئے۔ بنی اسماعیل کی جو اصلاح مطلوب تھی آپ نے اپنے ہاتھوں سے کی، شریعت کی جو امانت ان کے حوالہ کرنی تھی وہ نہ صرف یہ کہ ان کے حوالہ کی بلکہ اس پر عمل کرنے کا سلیقہ بھی ان کو سکھا دیا۔ فتح مکہ آپ کی جدوجہد کا وہ اہم موڑ تھا جس نے آپ کی پوری قوم کو آپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ بعثتِ خاص کے مقاصد کو اس طرح حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنی نبوت کے آفاقی پہلو کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ نے عرب کے گرد و نواح کی ریاستوں کے سربراہوں کو دعوت نامے بھیجے جن میں ان کو اسلام لانے کی ہدایت دی۔ آپ نے ان پر یہ بات واضح فرمائی کہ اسلام قبول کرنے ہی میں ان کی سلامتی ہے۔ اگر وہ اس کا انکار کریں گے تو نہ صرف ان کی اپنی گمراہی بلکہ ان کی قوموں کی گمراہی کا وبال بھی ان کی ذات پر پڑے گا۔ ان دعوت ناموں کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثتِ عام کے مقصد کو حاصل کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ ظاہر ہے کہ آپ اپنی زندگی میں اس عظیم کام کی داغ بیل ہی ڈال سکتے تھے کیونکہ یہ کام کسی ایک شخص کے بس کا نہ تھا بلکہ اس کے لیے لاکھوں انسان اور ان کی نسلیں درکار تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ایسی امت عطا فرمائی جس میں ہر ملک میں بسنے والے، دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے اور ہر زبان کے جاننے والے افراد شامل ہوں، جو ہر علاقے میں ہر زبان میں اور ہر کلچر اور ثقافت کے اندر قیامت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم کو پھیلا سکیں۔ امت کی اس ذمہ داری کو خود

قرآن مجید نے واضح فرما دیا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا
(سورہ بقرہ ۔ آیت ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

تمام سابق انبیاء کی دعوت اپنے جوہر کے اعتبار سے یکساں تھی لیکن دعوت کی تفصیلات میں قومی مزاج اور اجتماعی اخلاقی بیماریوں کا لحاظ رکھا جاتا رہا جس کے باعث یہ دعوت ایک محدود دائرے ہی میں مؤثر ہو سکتی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو جو تعلیم دی گئی اس میں عام فطرت انسانی کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس میں افراط ہے نہ تفریط، یہی وجہ ہے کہ امت مسلم کو امت وسط یعنی بیچ کی راہ پر چلنے والی امت کا نام دیا گیا۔ اس کے ذمہ جو کام ہے وہ وہ تبلیغ نہیں جس کا رواج ہمارے ہاں ہے، جس کے لیے لوگ یورپ، امریکہ اور افریقہ کا رخ کرتے رہتے ہیں اور جسے بڑا ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اس امت کے ذمہ حقیقت میں شہادتِ حق کا وہی کام ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرضِ منصبی تھا۔ یہ امت آپ کی نیابت میں اس پر مامور کر دی گئی ہے۔ لہٰذا یہ اس امت کا بھی فرضِ منصبی ہے۔

دین کی کمالیت :

اب دین کے اس پہلو پر غور کیجیے جس کو میں نے کمالیت کے جمال سے تعبیر کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جامہ ہمیشہ قامت کے لحاظ سے تراشا جاتا ہے اور بادہ ظرفِ قدح خوار کو دیکھ کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح سابق انبیاء نے اپنی اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ ان کے مزاج اور صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر دی۔ جہاں تک خدا کی توحید کا معاملہ ہے یہ تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اس کے سمجھنے میں ہر زمانے کے صحیح العقل اور سلیم الفطرت انسان کو کوئی بڑی زحمت پیش نہیں آسکتی تھی۔ لہٰذا توحید کی تعلیم میں ہر دور میں فی الجملہ یک رنگی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس وحدتِ آدم اور فطرتِ انسانی کی یکسانی کے مسائل آسانی سے سمجھ میں آنے والے نہیں تھے۔ اس لیے احکام و شرائع میں قوموں کے اجتماعی شعور، ان کے مزاج اور ذہنی و عقلی نشو و نما اور صلاحیتوں کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس لیے ان امور میں مختلف انبیاء کی تعلیم میں اختلاف پیدا ہوا کیونکہ ہر قوم کو ان

ہی دیا گیا جس کی وہ اہلیت رکھتی۔ کامل دین کے تحمل کی صلاحیت قوموں کے اندر ابھی پیدا نہ ہوئی تھی چنانچہ مسیح علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہ حقیقت واضح الفاظ میں سمجھائی۔ آپ نے فرمایا:۔

"مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنا ہے مگر تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا ۱۶ : ۱۲-۱۳)

اس تقریر میں آپ نے اپنی قوم کو یہ بتایا کہ کامل دین کے تحمل کی صلاحیت ابھی تک ان میں پیدا نہیں ہوئی۔ لہٰذا دین کی تکمیل خدا کے اس نبی کے ہاتھوں ہوگی جو میرے جانے کے بعد دنیا میں تشریف لائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے اہل عرب جس شریعت سے واقف تھے وہ یہود کی شریعت تھی۔ اس میں یہود کی قومی کمزوریوں کے لحاظ سے بعض وقتی اور عارضی احکام بھی دیے گئے تھے نیز چونکہ یہ قوم نہایت سرکش تھی تو جس طرح سرکش گھوڑے کو قابو میں رکھنے کے لیے مضبوط لگام دی جاتی ہے اسی طرح ان کی کج روی اور سرکشی کے سبب سے ان کی شریعت میں بعض ایسے احکام بھی موجود تھے جن کو قرآن مجید نے اصروا غلال یعنی بندھن اور بیڑیوں سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں عام فطرت انسانی سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو دین عطا فرمایا گیا وہ بنیادی طور پر تھا تو وہی جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام انبیاء کو دیا گیا تھا لیکن یہ جس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا گیا وہ اس کی کامل عقلی شکل ہے اور یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہ دین کی آفاقی شکل ہے اور ابد تک رہنے والی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا
(مائدہ - ۳)

اب میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اہل عرب کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام دین حنیف یا دین فطرت کے داعی تھے اور اس کے ماننے والوں کے لیے آپ نے ہی مسلم کا لفظ تجویز کیا تھا

اس دین کو کامل شکل میں پیش کرنے کا شرف آپ کی ذریت ہی میں سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا۔

محفوظیت کی شان

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو دین عطا فرمایا اس کی حفاظت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا۔ نزول وحی کے زمانہ میں شیاطین کی نقل و حرکت پر پہرے لگا دیئے گئے تاکہ وہ وحی پر تاخت نہ کر سکیں۔ جبریل علیہ السلام نہایت حفاظت سے وحی لاتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اسے پہنچاتے۔ آنحضرت ﷺ اس کو یاد کر کے لوگوں تک پہنچاتے۔ آپ کے کئی صحابہ اسے حفظ کر لیتے۔ ہر رمضان میں آنحضرت نازل شدہ قرآن مجید کا جبریل امین کے ساتھ مذاکرہ کرتے تاکہ قرآن ٹھیک ٹھیک یاد رہے۔ آنحضرت ؐ کے بعد بھی نسلاً بعد نسلٍ امت نے قرآن مجید کو حفظ کے ذریعے محفوظ رکھا۔ یہ اسی اہتمام کا نتیجہ ہے کہ آج کوئی شخص تلاوت میں کوئی غلطی کر دے تو سننے والوں میں سے کئی لوگ اس کو ٹوکنے والے موجود ہوتے ہیں۔

حفاظت قرآن کے لیے زبانی تعلیم ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ زبانی تعلیم میں اختلاط، نسیان، تحریف اور تبدیلی کے اتنے امکانات ہوتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ اصل تعلیم کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ پچھلے انبیاء کی تعلیم چونکہ زبانی تھی اس لیے وہ ان حوادث کا مقابلہ نہ کر سکی اور قلیل مدت ہی میں ان کے حاملین اس کو گم کر بیٹھے۔ قرآن مجید کے معاملہ میں تعلیم باللسان کے ساتھ ساتھ تعلیم بالقلم کا اہتمام بھی کیا گیا تاکہ اس میں کبھی کوئی القائے شیطانی نہ ہو سکے اور اس میں نسیان یا تحریف کا امکان باقی نہ رہے۔ ایک حد تک یہ اہتمام تورات کے لیے بھی کیا گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تورات اور قرآن مجید کے لیے کیے گئے اہتمام میں بنیادی فرق ہے۔ تورات کی حفاظت کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے اس کے حاملین ہی پر ڈالی جنھوں نے وحی الٰہی کو گم کرنے کے لیے اختلاط، تحریف، کتمان اور کتاب اللہ کے حصے بخرے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جہاں تک قرآن کا معاملہ ہے اس کی حفاظت کا ذمہ براہ راست اللہ تعالیٰ نے لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اور جن مل کر بھی اس میں ایک حرف کی تبدیلی نہیں کر سکے۔ روافض اور بعض دوسرے گمراہ فرقوں نے اس میں تحریف کرنے کی بڑی کوشش کی اور اس کو ہمارے بعض لوگوں نے قبول بھی کر لیا لیکن اس کے باوجود قرآن مجید بالکل محفوظ رہا اور آئندہ بھی محفوظ رہے گا۔

پھر اس دین کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر یہ بندوبست بھی کر دیا ہے کہ دنیا میں خواہ کتنا ہی فساد پھیل جائے اور افرادِ امت کتنے ہی بے راہ رو ہو جائیں، امت کا ایک گروہ خواہ اس کی مقدار کتنی ہی قلیل ہو، ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، اس کے دشمن اس پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ اس کے مخالفین اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اس کو ڈرایا یا خریدا نہیں جا سکے گا، اس کو مرعوب نہیں کیا جا سکے گا۔ یہ گروہ برابر صحیح تعلیم پیش کرتا رہے گا۔ اور حق کی شہادت قیامِ قیامت تک دیتا رہے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:۔

لایزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم حتی یاتی امر اللہ وھم کذالک (صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ باب لایزال طائفۃ من امتی)

میری اُمت کا ایک گروہ برابر حق پر حاوی رہے گا۔ جو ان سے الگ ہو گا۔ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر آ جائے گا اور وہ اسی حال میں ہوں گے۔

یہ حدیث الفاظ کے ذرا سے تغیر کے ساتھ کئی واسطوں سے بیان ہوئی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون حسب ذیل روایات میں بھی ہے:

ان الدین بدا غریبا ویرجع غریباً فطوبی للغرباء الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی۔ (جامع ترمذی، کتاب الایمان باب ما جاء ان الاسلام بدأ غریبا)

دین نے اجنبی ماحول میں آغاز کیا اور پھر یہ اجنبی ہو جائے گا پس مبارک ہے ان بیگانے لوگوں کو جو ان خرابیوں کی اصلاح کرتے رہیں گے جو میرے بعد میری سنت میں لوگ پیدا کریں گے۔

اس مضمون کی بعض روایتوں میں "دین" کی جگہ "اسلام" کا لفظ آیا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ جسدِ امت کے اندر فساد سرایت کر جائے گا لیکن اس کا ایک عضو اس سے بالکل محفوظ رہے گا۔ اس گروہ کے افراد ہر حالت میں اصلاحِ حال کی اذان دیتے رہیں گے تاکہ ہر دور میں نبیؐ کی سنت اور عمل زندہ اور قرآن کی دعوت کی صدا بلند ہوتی رہے۔

ابدیت کی آن:

نظامِ نبوت پر غور کیجیے تو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کہ انبیاء علیہم السلام

اس لیے آتے تھے کہ وہ خدا کی اتاری ہوئی وحی کو انسانوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں تاکہ انہیں ہدایت حاصل ہو سکے۔ انبیاء لوگوں کو آسمانی تعلیم کی طرف برابر بلایا کرتے۔ لیکن ان کی خاطر یہ نہیں کیا گیا کہ لوگوں کے دل ان کے لیے کھول دیئے گئے ہوں یا وہ ان کی اطاعت پر مجبور کر دیئے گئے ہوں۔ اوپر کے مباحث سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کی تعلیم قرآن مجید کی صورت میں محفوظ کر دی گئی ہے اور اس کی طرف بلانے کے لیے ایک گروہ بھی تکوینی طور پر مامور کر دیا گیا ہے۔ اس گروہ کے مخاطب لوگوں کو بھی آزادی ہے کہ وہ ان کی بات سنیں یا نہ سنیں، لیکن یہ گروہ انبیاء کی طرح حق کو قائم کرنے کی جد و جہد جاری رکھے گا۔ دوسرے الفاظ میں نبوت کے مقاصد کو حاصل کرنے کا مستقل انتظام اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلۂ نبوت کو قائم رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ کا لایا ہوا کامل اور محفوظ دین ابد تک رہنے والا ہے تاکہ دنیا کسی دور میں ہدایت سے محروم نہ رہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابد تک باقی رہنے والے دین کی تعلیم کے لیے ایک مختصر کتاب کافی ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کی ترتیب ہی میں ایسی تبدیلی کر دی گئی جس کے بعد وہ ہر قسم کے حالات میں قیامت تک انسانوں کا رہنما ہو سکے۔ پہلے زمانہ میں چھوٹی چھوٹی قوموں کے مسائل محدود ہوا کرتے تھے۔ انبیاء ان کو متعین حالات کے لیے متعین احکام دیتے جو لوگ ایمان لاتے وہ انہی متعین احکام میں دین کی پیروی کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے دنیا میں جہاں رسل و رسائل کے ذرائع میں اضافہ ہوا وہیں قوموں کے حالات مسلسل تغیر سے دوچار ہونے لگے۔ ہمارے زمانہ تک آتے آتے یہ تبدیلی اتنی تیز ہو گئی ہے کہ زندگی ہر آن تغیر پذیر ہے۔ لوگوں کو نت نئے اور گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ اس امت کو قیامت تک دین کی دعوت سے کر چلنا ہے اور تمام اقوامِ عالم اس کی مخاطب ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے نئے مسائل کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس امت کو اگر متعین حالات کے لیے متعین احکام دیئے جاتے تو قرآن مجید کی ضخامت کی بیسیوں کتابیں نازل کرنے کی ضرورت ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ہدایت کے مقصد سے کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوتا۔ لہٰذا قرآن مجید کی تعلیم میں یہ تبدیلی کی گئی کہ اس میں زندگی کے ہر دائرے میں ایسے کلیاتی احکام دیئے گئے جن سے مستقبل میں ابھرنے والے تمام مسائل کو گھیرا جا سکے۔ اس کے بعد امت کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ تمام مسائل میں ان کلیاتی احکام کی روشنی میں خود اپنی راہ متعین کرے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں نئے مسائل کے

لیے احکام کے اسی استخراج کا نام اجتہاد ہے جو ہمارے ہاں اسلامی قانون کا ایک مسلّم ماخذ ہے۔ دین کی ترتیب میں اس بنیادی تبدیلی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب ہر وہ بات جو ان کلیاتی احکام کی روشنی میں کہی جائے گی وہ خدا کی بات ہو گی۔ دنیا کے وہ تمام معروفات جو ان احکام کے منافی نہیں ہوں گے وہ پسندیدہ معروف ہوں گے جن پر عمل کرنا دین ہی پر عمل کرنا ہو گا۔ وہ تمام امورِ مصلحت جو قرآن و سنت کی ضد نہیں ہوں گے ان کا جواز تسلیم کیا جائے گا۔ دین کی ابدیت کی اس شان کو قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ امت ہر دور میں اجتہاد کرے اور تمام نئے مسائل میں اپنی راہ برابر متعین کرتی رہے۔ اس کے برعکس اگر یہ اجتہاد کا دروازہ ہی بند کر دے تو یہ اپنے وجود کے جواز ہی کو ختم کر دے گی۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ نظامِ نبوت کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے آسمانی ہدایت کا باقی رہنا ضروری تھا تو قرآن باقی ہے اور اس کا محافظ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی تعلیم کو پھیلانے کے لیے اس کے حاملین کا ایک گروہ موجود ہونا ضروری تھا تو ایسا ایک گروہ خدا کے تکوینی حکم کے تحت قائم ہے اور وہ قیامت تک موجود رہے گا۔ لہٰذا اب قیامت تک کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دے کر نبوت کا منصب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ رہ گئی ہماری بقا تو اگر ہم باقی رہنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ اس دین کو قیامت تک قائم رکھنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ ہمیں اپنا دینی مشن نہیں بھولنا چاہیے اور اس میں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اگر ہم یہ فرض ادا نہ کریں گے تب بھی یہ دین بہرحال قائم رہے گا۔ اللہ کا کلمہ بلند کرنے والا گروہ ناپید نہیں ہو گا۔ دوسرے لوگ آگے بڑھ کر دین کی مشعل تھام لیں گے اور اللہ تعالیٰ ساری نعمتیں ان کو دے دے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

دین پر قائم رہنے والے گروہ کے متعلق جو روایت اوپر بیان ہوئی ہے اس کی روشنی میں اور قرآن مجید کے بعض نصوص کے مطابق اس امت کی ایک رگ ہمیشہ زندہ رہے گی اور کبھی نہیں مرے گی۔ ابوداؤد میں اسی مضمون کی حامل ایک روایت یوں آئی ہے۔

عَنْ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فِيْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ جانتا ہوں اس میں

قال ان اللہ یبعث لهذه الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لها دینها۔

(سنن ابوداؤد۔ کتاب الملاحم باب ما یذکر فی قرن المائة)

یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ ہر صدی میں اس امت میں ایسے لوگ مامور فرمائے گا جو اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے۔

اس روایت کو فتنہ پروروں اور شیاطین نے اپنے مقصد کے لیے بہت استعمال کیا ہے اور ماضی میں مہدویت، مجددیت اور جھوٹی نبوت کے فتنے کھڑے کیے ہیں۔ اس روایت کے ظاہر الفاظ کے لحاظ سے انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ہر صدی میں ایک مجدد تلاش کیا جائے۔ کسی نے صدی کے اواخر میں اسے متعین کرنا چاہا اور کسی نے ہر صدی کے آغاز پر۔ چونکہ مجدد کی کرسی کو خالی رکھنا ممکن نہ تھا اس لیے ایسے لیسے لوگوں کو بھی مجدد مان لیا گیا جن کے علم پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور مجھے تو ان کے ایمان میں بھی تردد ہے۔ میرے نزدیک یہ سارا قصور روایت بالمعنیٰ کا ہے۔

جہاں تک روایت کا تعلق ہے صحاح ستہ میں ابوداؤد اس میں منفرد ہیں۔ شارحینِ حدیث کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ مرفوع حدیث ہے بھی یا نہیں۔ اگر یہ مرفوع ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصل روایت میں "بکل قرن" کے الفاظ رہے ہوں گے جن کو روایت بالمعنیٰ نے "علی راس کل مائة سنة" کر دیا۔ قرن کے معنی جہاں صدی کے آتے ہیں وہاں دور اور امت کے بھی آتے ہیں اور قرآن مجید کے استعمالات میں یہی معنی غالب ہیں۔ اسی طرح مَن کے لفظ کو صرف ایک تیسرے درجے کا مولوی واحد کے معنی میں لے گا۔ یہ لفظ جس طرح واحد کے لیے آتا ہے اسی طرح جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ میرے نزدیک یہ مضمون بالکل وہی ہے جو لا تزال طائفة من امتی والی مذکورہ بالا حدیث میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر دور میں امت کے اندر ایسے لوگوں کو پیدا کرتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتے رہیں گے اور اس فساد کی اصلاح کرتے رہیں گے جو لوگوں نے پیدا کر دیا ہو گا۔ لہٰذا میرے نزدیک ہر صدی میں کسی متعین شخصیت کو مجدد قرار دینے کا نظریہ درست نہیں۔ تمام صلحائے امت نے ہر زمانے میں دین کی جو خدمت کی ہے وہی وہ تجدیدِ دین ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دی تھی۔ ان صالحین کی خدمات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور وہ ان کو ان کا اجر عطا فرمائے گا۔ ہمارے مجدد قرار دینے سے ان کے مراتب پر کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن جاہلوں کو مجدد کا تاج پہنا کر ہم امت کی کوئی خدمت نہیں کریں گے بلکہ ہو سکتا ہے اس میں فتنہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

(ترتیب: خالد مسعود)

حکیم کا طرزِ فکر و تعلیم

امام شافعیؒ کے نزدیک حکمت کا مفہوم:

تمام بڑے اہل حدیث علماء کا دعویٰ یہ ہے کہ حکمت سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس کے لیے امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ کی تحریر سے دلیل لائی جاتی ہے جو یوں ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی اور اپنے رسول کی سنت کی اتباع لوگوں پر فرض کی ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

(بقرہ ۲ : ۱۲۹)

اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

(آل عمران ۳ : ۱۶۴)

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

نیز فرمایا:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ

(بقرہ ۲ : ۱۵۱)

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

یہ بھی فرمایا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

(الجمعہ ۲)

اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ایک جگہ فرمایا:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ

(بقرہ ۲ : ۲۳۱)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب وحکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری۔

دوسرے مقام پر یوں ہے:

وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا

(نساء ۴ : ۱۱۳)

اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔

یہ بھی فرمایا:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔

لَطِيفًا خَبِيرًا ۝ (احزاب ۳۳: ۳۴) بے شک اللہ باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو کتاب کا ذکر کیا جس سے مراد قرآن ہے اور دوسرے حکمت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کے بعض عالموں کو جو میرے نزدیک پسندیدہ ہیں میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس قول سے ملتا جلتا ہوا قول یہ بھی ہے کہ ان آیات میں اصلاً قرآن کا ذکر کیا گیا اور حکمت اسی کے تابع ہے (واللہ اعلم)۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے خلق پر اپنا احسان جتایا ہے کہ اس نے ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دی۔ لہٰذا یہ جائز نہیں کہ یہاں حکمت سے رسول اللہ کی سنت کے سوا کچھ اور مراد لیا جائے (واللہ اعلم)۔ کیونکہ حکمت کا لفظ کتاب اللہ کے ساتھ آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اطاعت فرض قرار دی اور لوگوں پر آپ کے احکام کی پیروی لازم قرار دی ہے۔ پس کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے سوا کسی قول کے بارے میں یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ فرض ہے۔ یہ اس لیے کہ رسول اللہ پر ایمان اور اللہ پر ایمان دونوں ایک ساتھ ضروری ہیں اور رسول اللہ کی سنت اللہ تعالیٰ کے مراد معانی کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ اس کے خاص اور عام مفہوم کی طرف رہنمائی دیتی ہے اللہ تعالیٰ نے لفظ حکمت کو لفظ کتاب کے ساتھ جوڑا ہے اور اس کے تابع بھی کیا ہے۔ تو یہ معاملہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے لیے نہیں کیا۔"[1]

یہ ہے امام شافعی کا کلام ان آیات کے بارے میں جن میں لفظ حکمت 'کتاب' یا آیات کے ساتھ جڑا ہوا آیا ہے۔ امام علیہ الرحمہ نے اس وضاحت میں اہل تاویل ہی کا ایک مذہب اختیار کیا ہے۔ چونکہ عام کبھی کبھی بعض خاص افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور حکمت کا لفظ فہم کے معنی میں آتا ہے اس لیے امام شافعیؒ سے پہلے کے علمائے تاویل مثلاً مجاہد وغیرہ نے اس کو کتاب اللہ کے فہم کے لیے خاص کر دیا۔ امام رحمہ اللہ نے اپنے عہد میں جب یہ دیکھا کہ فہم کتاب اللہ کے بعض مدعی قرآن کی تاویل غلط عقلیات کی روشنی میں کرتے ہیں اور لوگ اسی کو حکمت گمان کر لیتے ہیں تو اس پر امام صاحبؒ نے متنبہ کیا کہ کتاب اللہ کا فہم سنتِ رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اس بات کو بطورِ دلیل پیش کیا کہ سنت کتاب اللہ کی تبیین کرتی

[1] الرسالہ للشافعی، باب ما نزل عاماً دلت السنة خاصة۔ بیان فرض اللہ فی کتابہ اتباع سنة نبیہ۔ مصطفی البابی طبع ۱۹۴۰۔ ص: ۷۷-۷۹۔

ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سنتِ رسولؐ کے سوا کسی دوسرے شخص کے قول کی اتباع ہمارے اوپر فرض نہیں کی سو اس نے ہم پر قرآن اور حکمت کی تعلیم کا احسان کیا۔ لہٰذا ہم خدا کے نبی کی سنت کے سوا اور کوئی چیز اس لائق نہیں پاتے کہ جس کو کتاب اللہ کے ساتھ ملا سکیں۔ امام رحمہ اللہ نے یہ تاویل جو اختیار کی تو اس میں اُن کے حسنِ نیت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے سوا کسی چیز کو دخل نہیں۔ اللہ ہماری طرف سے ان کو جزائے خیر دے۔

امام صاحب نے اس مقام کے علاوہ دوسرے تمام مواقع میں حکمت کے مشہور معنی ہی مراد لیے ہیں۔ مثلاً وہ اسی کتاب کے خطبہ میں یوں لکھتے ہیں۔

"اللہ جل شانہٗ نے اپنی کتاب میں جو کچھ اتارا وہ سراسر رحمت اور حجت ہے۔ اس کا جاننا اصلی علم اور اس سے ناواقفیت اصل جہالت ہے۔ جو اس کو نہیں جانتا اس کا علم کچھ نہیں اور جو اس کو جانتا ہے وہ جاہل نہیں ہو سکتا۔[1] علم کے معاملہ میں لوگوں کے کئی طبقات ہیں۔ علم میں ان کا درجہ اسی قدر ہے جتنا ان کو قرآن کا علم حاصل ہے۔ پس ایک طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے علم میں اضافہ کے لیے اپنا پورا زور لگا دے اور اس کے حصول میں جو بھی رکاوٹ پیش آئے اس کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرے۔ اس کے سمجھنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے میں اللہ کے لیے اپنی نیت کو خالص رکھے۔ اس میں وہ اللہ ہی سے طالبِ مدد ہو کیونکہ کوئی خیر اللہ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے نص اور دلیل کی رو سے اللہ کے احکام کا علم اس کی کتاب سے پا لیا، پھر اس کو اسی کے مطابق کہنے اور کرنے کی توفیق بھی حاصل ہو گئی تو وہ اپنے دین اور دنیا میں فضیلت کا درجہ پانے میں کامیاب ہو گیا[2]

[1] مراد یہ ہے کہ جو شخص کتاب اللہ سے ناواقف ہے اس کا علم میں کوئی حصہ نہیں اور جو شخص اس کا علم رکھتا ہے اس کو کسی دوسرے علم کی حاجت نہیں۔ آگے اس بات کی انھوں نے تصریح فرما دی ہے (فراہی)

[2] دین اور دنیا میں آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کو کامل کر لیتا ہے، اس میں وہ شک کے در آنے کا موقع نہیں دیتا، اس سے اس کے دل میں ایمان کا نقطہ روشن ہو جاتا ہے تو اس کا علم ویقین اس کی نیت کی پاکیزگی اور عمل کے خلوص کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ایمان کے نقطہ میں سے شک کو نکال باہر کرتا ہے یہی رویہ وہ مسائل کی جزئیات میں سچی بات کا فیصلہ کرنے میں اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے حق باطل سے ممیز ہو جاتا ہے۔ (فراہی)

شکوک وشبہات اس سے دور ہوگئے۔ اس کے دل کو حکمت نے منور کر دیا اور اس نے دین میں امامت کا مرتبہ واجب کر لیا۔ پس ہم اللہ تعالیٰ سے — جس نے ہمارے اوپر نعمت کی ابتدا اس وقت کی جب ہم ابھی اس کے لیے استحقاق نہیں رکھتے تھے، وہ ہمیں اس سے برابر فیض یاب کر رہا ہے جب کہ ہم اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں اور جس نے ہمیں بہترین امت بنایا جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی — سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں پہلے اپنی کتاب کا پھر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا فہم عطا فرمائے اور ایسے قول وعمل کی توفیق دے جو ہم سے اس کا حق ادا کروادے اور ہمارے لیے مزید عطا واجب کر دے[1]۔"

یہ کلام عظیم فوائد پر مشتمل ہے اور اپنی گہرائی کی بنا پر شرح کا محتاج ہے۔ امام صاحب نے اس میں حکمت کی ایک بہت بڑی بنیاد کی طرف رہنمائی کی ہے۔ جس کے بعض نکات ہم یہاں بیان کرتے ہیں ......[2]

حکیم کا طرز فکر:

حکمت نفس کا کمال اور اس کا مقصود ہے۔ اس لیے یہی ابتدا اور یہی انتہا ہے۔ جن علوم سے حکمت کے حصول سے پہلے سابقہ پیش آتا ہے وہ اس کی معرفت کا ایک وسیلہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک آدمی پہلے جزئیات کا علم حاصل کرتا ہے، پھر ان سے مجموعی علم اخذ کرتا ہے، اس کے بعد اس مجموعی علم کی روشنی میں جزئیات کے علم کا دوبارہ جائزہ لیتا ہے تو ان جزئیات کا غلط یا صحیح ہونا اس پر روشن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حکمت حاصل ہونے کے بعد آدمی جب ان علوم کا جائزہ لیتا ہے جو اس کے حصول کا ذریعہ بنے تھے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں کئی باتیں خلط ملط اور بہت سے مسائل الٹ پلٹ ہو گئے تھے

[1] الرسالہ للشافعی، خطبۃ الکتاب، مصطفیٰ البابی طبع ۱۹۴۰ء ص ۱۹۔

[2] مصنف علیہ الرحمۃ نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ شاید وہ یہاں یہ وضاحت کرنا چاہتے تھے کہ امام شافعیؒ قرآن مجید کو تمام علم وحکمت کی بنیاد مانتے تھے۔ ان کے نزدیک اسی کا فہم حکمت کی کلید ہے اور ایک شخص اس کے فہم میں جس قدر ترقی کرے گا۔ وہ اسی قدر حکمت سے بہرہ ور ہو سکے گا۔ نیز امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح علم اور صحیح عمل دونوں کا جمع ہونا حکمت پیدا کرتا ہے (مترجم)

کامل معرفت اور تحقیق کے بعد ظن وتخمین پر مبنی کئی امور درست کیے جا سکتے ہیں۔ جو امور غیر واضح ہوتے ہیں وہ بھی صاف ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو یوں لگتا ہے جیسے پچھلے لوگ ان تمام امور کو جانوروں کی نگاہ سے دیکھتے رہے تھے۔ جب ایک حکیم آیا تو اس نے پہلی مرتبہ انسان کی نظر سے ان کو دیکھا۔ دوسرے الفاظ میں اشیاء معانی ومفہوم سے اس وقت تک خالی رہیں جب تک کوئی ایسا شخص ان تک نہیں پہنچا۔ جس نے ان کو سمجھا، کھولا اور ان کی وضاحت کی۔ پس آدمی جب تک معرفت حاصل نہیں کرتا وہ ان علوم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس کی تیاری کے لیے وضع ہوئے تھے۔ معرفت سے قبل ان سے فائدہ اٹھانا صحیح فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ اسی طرح ان کا علم بھی حقیقی علم نہیں ہے۔ بلکہ یہ علم بس متفرق قسم کے ادراکات اور گمراہ کن جذبات پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک حکیم کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے تمام احوال میں اسے پختگی اور نظم وضبط دکھائی دیتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ کائنات کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کا ایک خالق ہونا لازم ہے۔ جو تمام امور کو اس خاص مقصد کی طرف لے جا رہا ہے۔ پس حکیم کا یہ اندازِ فکر علم اور عمل کے درمیان پختہ تعلق پر مبنی ہوتا ہے۔ جو شخص ایک حکیم خالق پر ایمان نہیں رکھتا وہ نہیں جانتا کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی مقصد بھی ہے۔ پھر جب وہ اپنے دل میں ارادہ، طبیعت میں میلانات اور اچھے اور برے میں امتیاز کی صلاحیتیں موجود پاتا ہے تو اسے اس بات پر اطمینان نہیں ہو پاتا کہ یہ سب چیزیں واقعی کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہیں۔ وہ ان کو تقلید آبا، یا روایت پرستی یا نفس کی مخفی اغراض کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور ہر حال میں خیر اور شر کے وجود کے بارے میں بے اطمینانی کا شکار رہتا ہے۔ اسے کسی چیز کے وجود اور عدم وجود کا اطمینان بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اسے اپنے مشاہدہ پر بھی یقین نہیں آتا۔ وہ فطرت کو الزام دیتا ہے۔ ایسا شخص عمل کرتا ہے تو اسے اس کے انجام کا علم نہیں ہوتا۔ وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جو ایک تاریک رات میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے برعکس حکمت علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے مقصد اور اس غایت کے بارے میں اطمینان پیدا ہوتا ہے جس کی طرف ساری مخلوق بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا حکیم شخص اپنے خالق کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے۔ جس نے ہر چیز کی تدبیر بڑی حکمت سے کی ہے، جس نے ہر مخلوق کے لیے ایک غایت اور حکمت مقرر کر رکھی ہے اور جس

نے کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ایک حکیم خالق کوئی کام عبث نہیں کرتا۔ وہ دنیا کو جس طریقہ سے چلا رہا ہے اس پر ایک حکیم شخص کا راضی رہنا اس کی زندگی کا مقصد اور اس کی فطرت کا کمال ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ایک شکر گزار، راضی برضائے الٰہی اور مطمئن نفس کا مالک بن جاتا ہے۔

حکیم کا طریقۂ تعلیم:

حکمت چونکہ واضح، تمام علوم کی نسبت نفس سے قریب تر اور عقل سے زیادہ مطابقت رکھنے والی، زیادہ پھیلاؤ نہ رکھنے والی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ پردوں میں چھپی ہوئی ہے، جس کی طرف توجہ نہیں ہونے پاتی، اس لیے اس کی تعلیم دینے والے حکماء کو اس کے معارف بیان کرنے سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ معارف تو لوگوں کے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھے۔ انہیں دلچسپی اس بات سے ہوتی تھی کہ لوگوں کا رخ حکمت کی جانب پھیر دیں، ان کو غور و فکر پر آمادہ کریں، اور ان کو ان تاریکیوں کے حجابات سے نکالیں جو ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے نفس کے دو افعال کا سہارا لیا۔ ایک فکر و استدلال اور دوسرا خیر و سعادت کی طرف تحریک۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے قوتِ فکر اور قوتِ ارادہ کو بیدار کیا۔ کیونکہ انسان قوتِ فکر ہی کے ذریعے ان نشانیوں سے استدلال کر سکتا ہے جن سے آفاق و انفس بھرے پڑے ہیں اور قوتِ ارادہ ہی کی بدولت وہ خیر و سعادت کے کاموں کو پسند کرتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں انسان کی تمام صفات کی جامع ہیں اور نفس کی تمام حالتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا علم اگرچہ معارف سے لوگوں کو آگاہ کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔ لیکن نفس کی تربیت، تنویر، تزکیہ اور تطہیر میں وہ بہت سخت گیر ہوتا ہے۔ البتہ ہر شخص کا ذہن حکمت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے ایک شخص ڈاکٹر کے پاس جائے۔ اس کی دوا کھائے اور اسے شفا بھی حاصل ہو جائے۔ لیکن وہ بیماری کے دوبارہ حملے کی طرف سے بے خوف نہ ہو سکے۔ اس طرح کے لوگوں میں ایسے بہت سے عابد و زاہد لوگ بھی ہوتے ہیں جو حکمت سے فائدہ اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خود حکیم نہیں ہوتے۔ لیکن جو آدمی غور و فکر اور عمل کی صلاحیتوں کو کامل کر لیتا ہے۔ اس کو حکمت مل جاتی ہے۔ غور و فکر سے یہاں ہماری مراد منطقیانہ غور و فکر نہیں بلکہ الہامی ادراک ہے۔ اس شخص کی مثال اس آدمی کی ہے،

جس نے ایک چیز چکھی تو اس کے ذائقہ اور خوشبو کی خوبیاں اس پر روشن ہو گئیں پھر اس نے اس سے لطف اٹھایا یا سیر ہوا۔ اب اس کی نظر اس چیز کی تاثیر سے خالی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کا درخت اپنے پھل سے محروم ہو سکتا ہے۔

تمثیلات کے ذریعے تعلیمِ حکمت:

حضرت مسیح علیہ السلام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حکمت کی تعلیم تمثیلات کے ذریعے دیتے تھے۔ جب لوگ ان کی بات نہ سمجھتے تو انہیں اس چیز کا بڑا ملال ہوتا۔ لوگوں کو جن باتوں کا محض گمان ہوتا اور وہ ان کی حقیقت کو نہ سمجھتے تو حضرت مسیح اس مسئلہ کے اشکالات ان کے سامنے رکھتے تاکہ وہ خود غور و فکر کی عادت ڈالیں۔ افلاطون کہا کرتا تھا کہ جو شخص تمثیلات کے ذریعے بات نہیں کر سکتا وہ حکیم نہیں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام امثال کے ذریعے تعلیم دیتے۔ قدیم حکماء یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ اپنے آپ کو پہچانو۔

قرآن مجید بھی تمثیلات کے ذریعے حقائق کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ امثال کا مقصد تذکیر ہے تاکہ لوگ اپنے نفس اور اس کے اندر موجود صلاحیتوں کی طرف رجوع کریں۔ قرآن نے امثال کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ — ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔

(عنکبوت ۲۹: ۴۳)

۲۔ قرآن کا زیادہ تر استدلال نشانیوں سے ہے اور اس نے واضح کیا ہے کہ یہ استدلال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فہم و تدبر سے کام لیں۔

۳۔ قرآن مجید کی امثال اور نشانیاں گوناگوں پہلوؤں سے پیش کی گئی ہیں۔ اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ مسائل کو مختلف اطراف سے دکھانے کے لیے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید نے نشانیوں پر غور کرنے کے طریقہ کی طرف رہنمائی بھی کر دی ہے[1]۔

[1] یہ اشارہ ہے قرآن مجید کے معروف اسلوب "تصریفِ آیات" کی طرف۔ قرآن مجید کسی بات کو سمجھانے کے لیے کوئی ایک ہی پیرایہ استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ بات کو مختلف پہلوؤں سے کہتا ہے۔ نشانیوں کے بھی کسی ایک ہی پہلو کی طرف توجہ مبذول نہیں کراتا۔ بلکہ ان کے مختلف پہلوؤں (باقی صـ۲۶ پر)

اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام

اسلام نے جہاں دیگر تمام مسائل میں ضروری ہدایات قرآن وسنت میں مہیا کردی ہیں وہیں ان میں عورتوں کے اجتماعی حقوق وفرائض بالکل واضح اور صاف طور پہ بیان کر دیئے ہیں۔ عورت کا مرتبہ خاندان میں، عورت کی حیثیت اجتماعی زندگی میں، عورت کا رول ریاست میں، یہ ساری باتیں تمام اصولی ہدایات کے ساتھ خود قرآن مجید میں بیان کردی گئی ہیں اور پھر ان کی ضروری قولی وعملی تشریحات صحیح احادیث میں آگئی ہیں۔ لیکن پاکستان میں یہ مسئلہ ایسا الجھا دیا گیا ہے کہ اصل حقیقت شور وغوغا میں دب گئی ہے۔ جس طرح دیگر امور میں خالی دعوائے اسلام رہ گیا ہے اور عمل کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا اسی طرح اس اہم مسئلہ میں بھی قوم کے مرد وزن کبھی انتشار کا شکار ہیں۔ سیاسی لیڈر اپنی لیڈری چمکانے کی خاطر زبان سے اسلام اسلام پکارتے ہیں، اسلام اور اسلامی نظام کو پاکستان کے قیام کا واحد مقصد قرار دیتے ہیں اور اسلامی اصولوں ہی کے اندر دنیا کے تمام موجود مصائب کا علاج بتاتے ہیں لیکن جہاں تک عمل کی دنیا کا تعلق ہے اسلامی تہذیب وروایات کے جو آثار انگریزی دورِ حکومت کی دستبرد سے تھوڑے بہت بچ رہے تھے ان کو بھی مٹانے اور ان کی جگہ مغربیت کو غالب کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ یہ اسلام قائم ہو رہا ہے۔ اس بات کی شہادت یوں تو ہمارے لیڈروں کے ہر قول وفعل سے مل رہی ہے لیکن عورتوں کی اصلاح اور ترقی کے معاملہ میں انہوں نے جو روش اختیار کی ہے وہ ان کے اصلی عزائم کی آئینہ دار ہے اور ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ قوم کی بیٹیاں اپنی تہذیب وروایات اور اپنی مانوس معاشرت کو خیر باد کہہ کر مغربی تبرجات کے رنگ میں رنگ جائیں۔

قیام پاکستان کے جلد بعد مولانا امین احسن اصلاحی نے لیڈروں کی اس سکیم کو بھانپ لیا۔ انہوں نے ان کے اصل عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک کتاب 'پاکستانی عورت دوراہے پر' کے نام سے لکھی اس میں انہوں نے قومی زندگی میں نفاق کی پالیسی کو قوم کے لیے نہایت مہلک اور تباہ کن

قرار دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اگر اس طرح لیڈر لوگ قوم کو اسلام کی طرف بلانے کے ساتھ ساتھ کفر کی طرف دھکیلتے رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ قوم ہمیشہ کعبہ وکلیسا کے درمیان ڈانواں ڈول اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

خاص عورتوں کی حیثیت کے بارے میں مولانا نے ان تمام دلائل پر سیر حاصل بحث کی جو مغربی مفکرین نے پیش کیے اور جن کی بازگشت ہمارے قائدین اور مغربیت زدہ دانشوروں کی تقریروں اور تحریروں میں سنائی دیتی ہے۔ مولانا نے محکم دلائل وشواہد سے ان کا باطل ہونا ثابت کیا۔ انہوں نے دکھایا کہ عورت کی آزادی کی جو رو مغرب میں بہہ رہی ہے اس کے اثرات روس اور امریکہ کی معاشرت پر کس طرح مترتب ہو رہے ہیں اور وہاں کے اہل بصیرت کے خیالات اس بارے میں کیا ہے۔

اس معاشرتی مسئلہ پر سیر حاصل بحث کے بعد مولانا نے بتایا کہ عورتوں کے حقوق وفرائض کا جو نقشہ قرآن وحدیث نے پیش کیا ہے وہ کیا ہے۔ پردے کی حقیقت کیا ہے اور اس کے حدود وقیود کیا ہیں۔ کیا یہ ملاؤں کی ایجاد ہے یا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے گھر کے اندر غیر محرم مردوں کے داخلہ کے وقت کے پردہ اور عورت کے گھر سے باہر نکلنے کے وقت کے پردہ میں فرق کیا ہے اور اس کو قرآن کی نصوص سے ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ترقی کی دوڑ کے اس زمانے میں عورت کن کاموں میں حصہ لے سکتی ہے اور کن میں نہیں لے سکتی۔ اسی طرح یہ کتاب اس بحث میں نہایت دقیع اضافہ ہے جو آج عورت کی آزادی اور مساوات کے نام پر چل رہی ہے۔

مولانا کی یہ اہم تصنیف مدت سے نایاب تھی۔ اب اس کو فاران فاؤنڈیشن ۱۲۲ فیروز پور روڈ لاہور نے نہایت عمدہ کاغذ پر اچھی کتابت سے شائع کیا ہے اور اس کا نام 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' رکھ دیا ہے جو کتاب کے مضمون کو بہتر طریقہ پر نمایاں کرتا ہے۔ کتاب کے مندرجات پر نظر ثانی کی گئی ہے، اقتباسات کو اصل ماخذوں کے ساتھ تقابل کرکے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایڈیشن نہایت دیدہ زیب، مجلد اور طباعت کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ کتاب کی قیمت ۳۶ روپے ہے۔

ایضاح القرآن

یہ کتاب مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں انہوں نے قرآن مجید

کے مختلف اسالیب، اور اصول تاویل کو واضح کیا ہے اور بعض ایسی آیات کے معانی پر بحث کی ہے جو قرآن کے طالب علموں کے لیے اشکال پیدا کرتی ہیں اور جن کے مفہوم کے تعین میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اس کے علاوہ فاضل مصنف دو مضامین میں تفسیر کبیر اور تفسیر ابن کثیر کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔ تفسیر کبیر کے متعلق انھوں نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ اس کے کون سے حصے امام رازی نے خود تحریر کیے تھے اور کون سے حصے ان کی ناتمام تفسیر کو مکمل کرنے کے لیے ان کے بعد احمد بن خلیل خولی نے لکھے۔ تفسیر ابن کثیر کی خصوصیات زیر بحث آئی ہیں۔

قرآن مجید کے اسالیب اور اصول تاویل امام حمید الدین فراہی کے افادات سے ہیں فاضل مصنف نے ان مباحث کو اپنے طرز پر نئی ترتیب دے کر لکھا ہے۔

جن آیات کے معانی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کی تعداد چھ ہے۔ یہ سورہ لبقرہ کی آیات ۵۹، ۱۰۲، ۱۵۸، اور ۱۸۳ – ۱۸۵، سورہ اعراف کی آیات ۴۶ – ۴۹ اور سورہ مریم کی آیت ۲۷ ہیں۔ ان سب میں فاضل مصنف نے پہلے مختلف منقول تفسیریں بیان کی ہیں، پھر ان پر بحث کر کے اشکالات کو متعین کیا ہے اور اس کے بعد نظم قرآن اور نظائر کی روشنی میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ ایک مضمون سورہ فاتحہ کے بارے میں بعض سوالات کے جواب میں ہے۔ ایک اور مضمون میں مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق مباحث میں تفاوت کیوں ہے۔

کتاب کے مباحث قرآن کے طالب علموں کے لیے نہایت مفید ہیں۔ ۳۲۸ صفحات کی اس مجلد کتاب کی قیمت ساٹھ روپے ہے اور اسے یونائیٹڈ بک کارپوریشن ادب منزل اردو بازار کراچی نے شائع کیا ہے۔

اطلاع

تدبر کے نئے خریدار عموماً یہ تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں اب تک شائع ہونے والے تمام پرچے مہیا کیے جائیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر ادارہ نے تدبر کے شمارہ (۱ تا ۱۰) اور (۱۱ تا ۲۰) کی جلد بندی کرالی ہے۔ قارئین جو ان مجلد شماروں کو حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ پچاس روپے فی جلد کے حساب سے رقم بھیج کر رسالہ منگوا سکتے ہیں۔

(ادارہ)

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	..–..
۲۔ اقسام القرآن	۵–..
۳۔ ذبیح کون ہے	۵–..

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد)	۹۰۰–..
: فی جلد	۱۰۰–..
۲۔ مبادئ تدبر قرآن	۳۶–..
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین	..–..
۴۔ اسلامی ریاست	..–..
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱۶–..
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام	۴–..
۷۔ تنقیدات	۱۸–..
۸۔ توضیحات	۲۱–..
۹۔ تزکیہ نفس : جلد اول	۴۵–..
: جلد دوم	...–..
۱۰۔ مبادئ تدبر حدیث	...–..
۱۱۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار	۳۳–..
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	۳۶–..
۱۳۔ حقیقت شرک و توحید	۵۶–..
۱۴۔ حقیقت نماز	۱۸–..
۱۵۔ حقیقت تقویٰ	۱۸–..

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور — ۵۴۶۰۰ — پاکستان۔ فون : ۲۸۳۴۷۷